
ایک نوجوان کی زندگی کا فسانہ عبرت ہے جس نے
اپنے بے گناہ والدین کو قتل ہوتے دیکھا تھا
دھواں
شمیم نوید

پیش لفظ

ہمارے معاشرے کو ظالم جاگیرداروں' زمینداروں اور بڑے بڑے وڈیروں نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ وہ حق داروں کو ان کا حق ادا نہیں کرتے۔ ان کے ظلم کے ظلم و جبر کی ہول ناک داستانیں زباں زد عام ہیں۔ انہی ظالموں کے ظلم کی وجہ سے ہمارا ملک گذشتہ پچاس برس میں ترقی کی وہ منزلیں طے نہیں کر سکا جس کا خواب ہمارے اجداد نے دیکھا تھا۔ زیر نظر ناول ”دھواں“ میں ایسے ہی حالات و واقعات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول ظلم اور معاشرتی جبر کے خلاف ایک آواز ہے۔ یہ ناول ایک ایسے معصوم بچے کی روداد ہے جس نے اپنی آنکھوں سے اپنے والدین کو قتل ہوتے دیکھا اور پھر قاتل اس کی جان کے بھی درپے ہوگئے۔ پھر بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے سینے میں انتقام کا الاؤ دہک رہا تھا۔ اس نے عزم و ہمت کا سہارا لے کر اپنے وجود میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کیا۔ اس کوشش میں جوان ہو کر اسے قدم قدم پر بے رحم موت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ ناول ان ظالموں کے لیے ایک تازیانہ عبرت ہے جو اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ تقدیر ہمیشہ ان پر مہربان رہے گی۔ لحہ لحہ پر تجسس واقعات کے بیان کی وجہ سے اس ناول کو ایک بار شروع کر کے پڑھنے والا اسے اپنے ہاتھ سے نہیں رکھتا۔

ہمیں امید ہے کہ معاشرتی جبر کے پس منظر میں لکھا جانے والا یہ ناول آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔ برادر عزیز مبین خٹک پہلی مرتبہ اسے کتابی صورت میں ہماری اجازت سے شائع کر رہے ہیں۔

ہمارے تحریر کردہ دیگر ناولوں کے موضوعات سے اس ناول کا موضوع قطعی مختلف اور اچھوتا ہے۔ انشاء اللہ ہمارے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول کو بھی آپ سند پسندیدگی عطا کریں گے۔

خلوص آگیں

شمیم نوید

اس رات سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا سارا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور حواس پر ایک انجانا سا خوف مسلط تھا۔ مجھے اماں کی بات یاد آئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جب کبھی ڈر لگے تو تین بار کلمہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرو، میں اس سے پہلے بھی کئی بار اماں کی ہدایت پر عمل کر چکا تھا۔ کلمہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرنے سے میرا خوف ختم ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس وقت بھی دل ہی دل میں جلدی جلدی کلمہ پڑھنے لگا۔ توقع کے مطابق کلمہ پڑھ کر خود پر دم کرنے سے میرا خوف جاتا رہا تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔

کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ برابر والے پلنگ پر میری اماں، چھوٹے بھائی کے ساتھ بے خبر سو رہی تھی۔ ساتھ ہی میرے "ابے" کا پلنگ تھا۔ وہ بھی سو رہا تھا۔ اس کے سرہانے ذرا سی اونچائی پر ایک کھڑکی تھی جو دن کی طرح اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی۔

میرا "ابا" اکثر اماں کو تاکید کیا کرتا تھا کہ سونے سے پہلے یہ کھڑکی بند کر دیا

کرو اماں کبھی تو کھڑکی بند کر دیتی تھی اور کبھی بھول جاتی تھی۔

آج بھی وہ کھڑکی بند کرنا بھول گئی تھی۔ میں پہلے ابے کے پاس سوتا تھا‘ لیکن گذشتہ دو مہینے سے اماں نے میرا بستر الگ کر دیا تھا۔ اماں کا کہنا تھا کہ اب میں بڑا ہو چکا ہوں‘ مجھے الگ سونا چاہئے۔ ”ابے“ نے کہا بھی تھا کہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے‘ بارہ سال ہی کا تو ہے! مگر اماں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اگر اماں نے وہ فیصلہ نہ کیا ہوتا یا اس رات میری آنکھ نہ کھل جاتی تو یقیناً میں اپنی یہ سرگزشت بیان کرنے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔

اس ہول ناک رات کا ایک ایک لمحہ آج بھی میرے احساس میں زندہ ہے۔ خوف ختم ہونے کے بعد مجھے ٹوائلٹ جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ عموماً رات کے وقت جب مجھے ٹوائلٹ جانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو میں اماں کو جگا دیتا تھا‘ لیکن وہ اس پر ناراض ضرور ہوتی تھی اور کہتی تھی کہ اب تم بچے نہیں رہے جو مجھے خواہ مخواہ سوتے سے اٹھا دیتے ہو اگر آئندہ تم نے مجھے جگایا تو پیٹوں گی تمہیں! اماں کی ڈانٹ کے خوف سے میں اسے جگائے بغیر بستر سے اٹھ گیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے آہستہ سے کنڈی کھولی اور باہر چھوٹے سے صحن میں پہنچ گیا۔ صحن کی ایک جانب کونے میں ٹوائلٹ تھا۔ کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تھا کہ سرد ہوا کمرے میں داخل نہ ہو کیوں کہ وہ سردیوں کے دن تھے۔ گرم بستر سے باہر صحن میں آکر مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ صحن عبور کرکے میں کانپتا ہوا ٹوائلٹ میں گھس گیا۔

پھر جب میں ٹوائلٹ سے نکل کر کمرے کی طرف واپس جا رہا تھا تو دوبارہ مجھے انجانے خوف نے آگھیرا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا تیزی سے دھڑکتا ہوا دل پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ کمرے کے قریب پہنچتے ہی میں نے گھٹی گھٹی سی ایک چیخ سنی اور میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ میرے قدموں نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا‘ کچھ تو سردی کی وجہ سے اور کچھ خوف کے سبب میرے پیر

کانپ رہے تھے۔ نتیجتاً میں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا اور کمرے کے دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

اندر کمرے میں مجھے کچھ غیر معمولی سرگرمی سی محسوس ہوئی۔ خوف کے باوجود میں اپنے تجسس پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ کے دباؤ سے دروازے میں جھری پیدا ہو گئی۔ میں نے جھری سے آنکھ لگا دی۔ پھر مجھے کمرے میں جو ہول ناک منظر نظر آیا‘ اس نے میرے حواس گم کر دیئے۔ خوف ناک چہرے والا ایک اجنبی‘ میرے ”ابے“ کے اوپر جھکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا خنجر تھا ”ابے“ کا لحاف زمین پر پڑا تھا۔

”جلدی کرو‘ ہمیں صبح ہونے سے پہلے واپس گاؤں بھی پہنچنا ہے۔“ کمرے میں ایک سرگوشی گونجی اور میری نگاہ دوسرے اجنبی پر پڑی جو میری اماں کے پلنگ کے سرہانے کھڑا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ میرا ”ابا“ اب تک کس طرح بے خبر سو رہا تھا۔ وہ تو بڑی چوکنا نیند سوتا تھا اور ذرا سی آہٹ سے اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ یہی حال اماں کا تھا۔ وہ بھی اپنے پلنگ پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ وہ دونوں اجنبی کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی ہی سے اندر آئے ہوں گے‘ میں یہ سمجھ گیا تھا۔ ”ابے“ کے اوپر جھکے ہوئے خوف ناک چہرے والے اجنبی کے بائیں رخسار پر کسی زخم کا گہرا نشان تھا۔ اس نشان نے اس کے چہرے کو مزید ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھی اور چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں جیسے شعلے اگل رہی تھیں۔

”میں ذرا اس کی بے ہوشی گہری ہونے کا انتظار کر رہا تھا مگر تو کہتا ہے تو .....“ خوف ناک چہرے والا کسی سانپ کی طرح پھنکارا اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر خنجر بلند کیا۔

"دوسرے ہی لمحے لمبا خنجر میرے "ابے" کے سینے میں اتر گیا۔ وحشت کی وجہ سے میری قوت گویائی سلب ہو گئی۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میری چیخ سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ سینے سے خنجر باہر آتے ہی میرے "ابے" کا جسم تڑپنے لگا۔ میں نے اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابلتے دیکھا۔ اجنبی نے دوسرا وار کیا۔ یہ وار اس نے "ابے" کی گردن پر کیا تھا پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ گردن سے بھی خون ابلنے لگا تھا۔

"اب اس سنپولئے کو بھی ختم کر دے۔" خوف ناک چہرے والے کے ساتھی کی آواز ابھری۔ وہ ہاتھ سے میرے چھوٹے بھائی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جو "ابے" کے ساتھ ہی پلنگ پر سو رہا تھا۔ "ابے" کے سینے اور گردن سے ابلتے ہوئے خون میں میرا چھوٹا بھائی بھی جیسے نہا گیا تھا۔

پھر میری آنکھوں نے دوسرا دہشت ناک منظر دیکھا۔ خوف ناک چہرے والے سفاک اجنبی نے میرے چھوٹے بھائی کے گلے پر خنجر پھیر دیا تھا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کسی جانور کو ذبح کرتے ہیں۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا۔ میرا چھوٹا بھائی مجھ سے دو سال چھوٹا تھا اور ہم دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس معصوم کا جسم بھی تڑپنے لگا۔ اس دوران میرے "ابے" کا جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو چکا تھا۔

"اب جلدی سے بی بی کو اٹھاؤ اور یہاں سے نکل لو!" خوف ناک چہرے والے نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ میں نے اپنے گم ہوتے حواس اور شدید احساس خوف کے باوجود یہ بات محسوس کی کہ اماں کے لئے اس بے رحم شخص کے لہجے میں احترام تھا۔

"بے وقوف ہو تم! ابھی ہمارا کام مکمل نہیں ہوا۔ کیا تم بھول گئے کہ ہمیں بتایا گیا تھا' بی بی جی کے دو بیٹے ہیں جن کی عمریں کوئی دس اور بارہ سال ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بی بی جی کا بڑا بیٹا ابھی زندہ ہے۔ یہ ..... یہ شاید

اسی کا بستر ہے۔" دوسرے اجنبی نے میری چارپائی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ملک جی" کا حکم تھا کہ بی بی جی کے دونوں بیٹوں کو بھی قتل کرنا ہے۔

"مگر وہ گیا کہاں؟ بستر تو خالی ہے۔" خوف ناک چہرے والا بولا۔

"وہ گھر ہی میں ہو گا' جا کہاں سکتا ہے! آؤ اسے تلاش کرتے ہیں۔" دوسرے اجنبی نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔

اب وہ دونوں مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں' یہ سنتے ہی میرے سارے جسم میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی۔ پھر نہ جانے کیسے اور کہاں سے میرے جسم میں اتنی طاقت آگئی کہ میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ فوری طور پر میرے ذہن میں چھپنے کی جگہ بھی آگئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہی صحن میں موجود اس کوٹھری کی طرف بھاگنے لگا جس میں گندم اور دوسری اجناس رکھی جاتی تھیں۔

ابھی میں اس کوٹھری کے دروازے سے چند قدم دور تھا کہ اپنے عقب میں کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں اجنبی' کمرے کے دروازے سے باہر آرہے تھے۔

"رک جاؤ!"

ان میں سے ایک نے سرسراتی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

رکنے کا مطلب موت ہے میں نے سوچا اور پھر جست بھرتا ہوا کوٹھری کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھا کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اندر گھس کر کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میری پشت دروازے سے لگی ہوئی تھی۔

چند ہی لمحے بعد کوٹھری کے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر انہی دونوں میں سے کسی نے مجھے مخاطب کیا۔

"دروازہ کھول دو ورنہ ہم اسے توڑ کر اندر آجائیں گے!"

میں کانپ کر رہ گیا۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر میں کیا کروں گا؟ فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ اس کوٹھری کا ایک عقبی دروازہ بھی تھا۔ وہ عقبی دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا میں نے سوچا کہ اگر انہوں نے کوٹھری کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی تو میں عقبی دروازہ کھول کر یہاں سے فرار ہو جاؤں گا اور یہاں سے باہر نکلتے ہی چیخ چیخ کر گاؤں والوں جگا دوں گا۔

پھر وہ دونوں پہلے تو مجھے دھمکیاں دیتے رہے' اس کے بعد انہوں نے مجھے بہلانا پھسلانا شروع کر دیا' مگر میں نہ ان کی دھمکیوں میں آیا نہ بہلانے پھسلانے کا مجھ پر اثر ہوا۔ میں نے ان کی کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ جب کافی دیر گزر گئی تو وہ شاید مایوس ہو گئے۔

"اسے چھوڑو اور بی بی جی کو لے کر چل دو یہاں سے!" ان میں سے ایک کی سرگوشی میں نے سنی۔ "یہ جائے گا کہاں! رہے گا تو اسی گاؤں میں! ہم کسی اور وقت آکر اس کا قصہ پاک کر دیں گے۔" پھر اس کی آواز اور دھیمی ہو گئی۔ "شکر کرو اس نے چیخنا چلانا شروع نہیں کیا ورنہ ہم مشکل میں پھنس جاتے۔"

"اچھا تو چلو!"

دوسرے اجنبی کی آواز ابھری۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے دور جاتے قدموں کی آواز سنی۔ موت کا خطرہ ٹل گیا ہے' اس احساس کے ساتھ ہی جیسے میرے پیروں میں جان نہیں رہی۔ میں اب تک دروازے کے قریب ہی کھڑا رہا تھا' سو وہیں بیٹھ گیا۔

ان قاتلوں نے میرے والد اور چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا تھا مگر اماں کو زندہ رہنے دیا تھا۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے میں نے چند باتیں سمجھ لی تھیں۔ ایک بات تو یہ کہ انہوں نے کسی طرح میرے والد' بھائی اور اماں کو پہلے بے ہوش کر دیا تھا اور پھر والد کے ساتھ میرے بھائی کو قتل کر دیا تھا۔ اماں

کو وہ اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کسی "ملک جی" کا ذکر بھی کیا تھا جس کے حکم پر ہم دونوں بھائیوں کو بھی قتل کرنا تھا۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے تو میرے "ابے" نے اماں سے کہا تھا کہ اب ہمیں یہ گاؤں بھی چھوڑ دینا پڑے گا' مجھے یہاں خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔ جواباً اماں نے کہا تھا' اب تو برسوں بیت گئے ہیں' انہوں نے صبر کر لیا ہو گا' تیرہ برس کوئی کم تو نہیں ہوتے! میرا "ابے" چپ ہو گیا تھا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ اس کی یہی خاموشی موت کا پیغام بن گئی تھی۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اسی طرح کی باتیں سنتا آ رہا تھا۔ مجھے وقتاً فوقتاً اپنے "ابے" اور اماں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دونوں اپنے کسی دشمن کی طرف سے خوف زدہ اور فکر مند رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی ایک جگہ ایک دو سال سے زیادہ نہیں رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو چند ماہ بعد ہی وہ اپنا ٹھکانا بدل دیتے تھے۔ جہلم کے اس گاؤں جادہ میں رہتے ہوئے ہمیں دو سال ہو رہے تھے اور میرا "ابے" اب یہ گاؤں چھوڑ دینا چاہتا تھا' مگر اسے علم نہیں تھا کہ یہ گاؤں ہی اس کی آخری منزل ثابت ہو گا۔

خاصی دیر تک میں یہ سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ مگر کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ معاً مجھے ان دونوں میں سے ایک کی یہ بات یاد آئی کہ وہ کسی اور وقت آکر میرا قصہ پاک کر دیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں اس گاؤں میں میری زندگی کو خطرہ تھا ابھی میں یہ سوچ رہا تھا تو اچانک میری سماعت سے "ریل کی سیٹی" کی آواز ٹکرائی اور میں چونک اٹھا۔

"ریل کی سیٹی" نے مجھے بروقت ایک راہ سجھا دی۔ میں اسے قدرت کی طرف سے اپنے لئے ایک اشارہ سمجھا۔ مجھے عین اس وقت ریل کی سیٹی سنائی دی تھی جب میں یہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں میں میری زندگی کو خطرہ ہے۔ ریلوے

اسٹیشن ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں ریل میں بیٹھ کر یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں۔ میں نے سوچا۔ اسی خیال کے ساتھ جیسے میرے جسم میں نئی قوت آگئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے آج ہی رات یہاں سے فرار ہو جانا چاہئے۔ پھر میں دوسرے ہی لمحے اٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹھری کا دروازہ کھول کر دوبارہ گھر میں جانے کی بجائے میں نے عقبی راستے کا رخ کیا۔ میں اب گھر میں جاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کیا خبر وہ قاتل اب بھی وہاں میری گھات میں بیٹھے ہوں!

آہستہ سے میں نے کوٹھری کا عقبی دروازہ کھولا اور گلی میں نکل آیا۔ ہر طرف سناٹا اور تاریکی تھی۔ گلی سے نکل کر میں چوکنا انداز میں ریلوے اسٹیشن کی طرف ہو لیا۔ عام حالات میں اتنی رات کو میں گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا' مگر اس وقت مجھے خلاف توقع کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ریلوے اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ وہاں درمیان میں ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا۔ میں اس کے عقب میں پہنچ کر رک گیا کہ اگر کمرے میں کوئی ہو تو مجھے نہ دیکھ سکے۔ میں اس وقت پلیٹ فارم پر قدم رکھنا چاہتا تھا جب کوئی ریل آجاتی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے زیادہ دیر ریل کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دور سے ریل کی سیٹی سنائی دی تو میں چوکنا ہو گیا۔

ذرا ہی دیر بعد ریل' اسٹیشن پر آگئی۔ میں لپک کر اس کی طرف بڑھا اور ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ ڈبے میں زیادہ مسافر نہیں تھے۔ کچھ سیٹیں خالی تھیں۔ میں ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سامنے والی سیٹ پر متوسط عمر کا ایک شخص' ایک عورت اور بچی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس بچی کی عمر میرے چھوٹے بھائی کے برابر معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بہت بھولی اور بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی۔ ریل میں اس اسٹیشن سے چڑھنے والا واحد مسافر صرف میں تھا۔ میں نے وہاں نہ کسی کو اترتے دیکھا تھا نہ چڑھتے۔ وہاں کوئی ایک منٹ رک کر ریل نے یکے بعد دیگرے تین سیٹیاں دیں اور پھر چل پڑی۔

ریل کے چلتے ہی مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی' مجھے کچھ ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ ریل کہاں جا رہی تھی! شاید میرے چہرے سے بھی خوف کا اظہار ہونے لگا تھا غالباً اسی لئے سامنے والی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے نرم آواز میں مخاطب کیا۔

"تم خوف زدہ کیوں ہو بیٹے؟ کیا بات ہے؟"

"مم .... میں! نن .... نہیں تو جی!" میں نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تمہارے ساتھ کوئی اور نہیں؟ تم اکیلے ہو؟"

اس شخص نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

"جی ..... جی ہاں' اکیلا...... میں اکیلا ہی ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

اس شخص نے دریافت کیا۔

یہ شخص تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے! میں نے سوچا۔ اس بار اس نے مجھ سے جو سوال کیا تھا' میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسی لئے جواباً کچھ نہ بولا۔

"چپ کیوں ہو بیٹے' بولو نا!"

اس شخص کے لہجے میں نرمی اور شفقت تھی۔

"ڈرو مت! بتا دو کہاں جا رہے ہو؟"

"مجھے ..... مجھے نہیں معلوم!" میں نے کہہ ہی دیا۔

میری بات سن کر وہ چونک اٹھا اور زیر لب بڑبڑایا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ ..... حیرت ہے!"

پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"یہاں آؤ۔ ادھر میرے پاس! یہاں آکر بیٹھ جاؤ' شاباش!"

میں کچھ ڈرتا جھجکتا سا اپنی سیٹ سے اٹھا اور اس شخص کے پاس بیٹھ گیا۔

"تم اپنے گھر سے بھاگے ہو' نا؟" اس نے محبت سے میرے سر پر ہا پھیرا۔ میں نے اقرار میں سرہلا دیا تو وہ مزید بولا۔

"تمہارے ابو یا امی مارتے ہوں گے تمہیں؟ ہیں نا؟"

"نہیں۔"

اس بار میں بول اٹھا۔

"وہ ..... وہ دونوں تو مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔" یہ کہتے ہوئے میر آواز بھرا گئی۔

پھر آہستہ آہستہ اس شخص کے استفسار پر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا عورت بھی اب میری باتیں غور سے سن رہی تھی۔ میری دکھ بھری روداد سن اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے۔ مجھے اس عورت کے چہرے اپنی اماں جیسی نرمی اور محبت محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ بتاؤ بیٹے! کبھی تم نے اپنے والد یا والدہ سے یہ بھی سنا کہ ان کا دشم کون ہے؟ کبھی انہوں نے کسی کا نام لیا تھا اس سلسلے میں؟ ذرا سوچو' زور د اپنے دماغ پر!" اس شخص نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے معلوم کیا۔

"نہیں جناب۔" میں نے جواب دیا۔

"کبھی میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی"۔

"ہوں!" وہ شخص سوچ میں پڑ گیا' پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ پھر تو بہت مشکل ہے۔"

اس کے بعد وہ عورت سے مخاطب ہوا۔

"سنو! تمہارا کیا خیال ہے اگر ہم اس بے سہارا بچے کو اپنے ساتھ لاہو لے چلیں؟ یہ یتیم ہو چکا ہے اور یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا نیکی ہے۔"

"میں تو خود آپ سے یہی کہنے والی تھی۔"

عورت محبت بھرے لہجے میں بولی۔ "ہمارے کوئی بیٹا بھی نہیں ہے' ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں گے۔ ہمارے لئے جیسی جمیلہ ہے' ویسا ہی یہ ہو گا۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مرد اور اور عورت میاں بیوی ہیں اور جمیلہ ان کی بیٹی کا نام ہے۔

"ہاں تو بھئی' تم ہمارے بیٹے بنو گے بولو؟" اس شخص نے مجھے خود سے قریب کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

میں کیا انکار کرتا! میرا اب تھا بھی کون! میں نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

"ارے ہاں' ابھی تو ہم نے اپنے بیٹے کا نام بھی نہیں پوچھا۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"سراج الدین۔" میں نے بتایا۔

"سراج الدین بیٹے! مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمہارا نام بدل دیں۔ تاکہ تمہارے دشمن تمہیں ڈھونڈتے ہوئے خدانخواستہ کبھی لاہور تک بھی پہنچ جائیں تو کم از کم نام سے تمہیں نہ پہچان سکیں۔" وہ شخص کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے تمہارا نام محمود رکھ دیا جائے۔" یہ کہہ کر اس نے عورت کو مخاطب کیا۔

"تم کیا کہتی ہو رشیدہ؟"

"محمود بھی ٹھیک ہے مگر مجھے فیروز زیادہ پسند ہے۔"

عورت جواباً بولی۔

"اچھا تو پھر فیصلہ بیٹے پر چھوڑ دیتے ہیں ہاں بھئی تمہیں دونوں میں سے کون سا نام پسند ہے؟"

اس شخص نے مجھ سے پوچھا۔

اسی وقت میری نگاہ عورت کی طرف اٹھی وہ مجھے متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھی سو میں نے اسی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

"چلو تو پھر فیروز طے ہو گیا۔ تو فیروز بیٹے' آج سے ہم تمہارے ابو ہیں اور یہ تمہاری امی!"

یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے بارے میں مختصراً بتانے لگا۔

"میرا نام امجد ہے اور میں سرکاری ملازم ہوں۔ میں رہنے والا تو فیصل آباد کے ایک گاؤں علی پور کا ہوں مگر ملازمت کی وجہ سے لاہور میں قیام ہے۔ وہاں ایک محلہ ہے مغل پورہ' اسی میں رہتا ہوں"۔

میں خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا۔ میں اب ایک نئے نام کے ساتھ نئی زندگی شروع کر رہا تھا۔ قدرت کو شاید یہی منظور تھا۔ میں بہرحال ان لوگوں کے ساتھ لاہور آگیا۔ میرے والد نے مجھے "جاوہ" کے سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ مگر وہ اسکول صرف چھٹی جماعت تک تھا۔ گزشتہ چھ مہینے پہلے میں چھٹی جماعت پاس کر چکا تھا۔ لاہور پہنچ کر امجد صاحب نے مجھے ساتویں کلاس میں داخل کرانا چاہا مگر میں ٹیسٹ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجتاً دوبارہ چھٹی جماعت میں مجھے داخل ہونا پڑا۔ اسی اسکول میں جمیلہ بھی پڑھتی تھی۔ وہ پانچویں کلاس میں تھی۔ داخلے کے بعد ہم دونوں ساتھ ساتھ اسکول جانے لگے۔

لاہور آنے اور ایک گھر میں پناہ مل جانے کے باوجود مجھے اپنے والدین اور بھائی کی بہت یاد آتی اور میں اداس ہو جاتا۔ اسی کے ساتھ میری آنکھوں میں اپنے والد اور بھائی کے قاتل کا چہرہ گھومنے لگتا۔ وہ قاتل چہرہ صفحہ ذہن پر ثبت ہو کے رہ گیا تھا۔ میں اکثر سوچتا کہ اگر وہ سفاک قاتل زندگی کے کسی موڑ پر مجھے مل گیا تو میں اس سے انتقام ضرور لونگا۔ انتقام کے اس جذبے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ابھی سے خود کو اس کے لئے تیار کرنے لگوں میں ورزش کرنے لگا۔

پانچ سال جیسے پلک جھپکتے گزر گئے۔ میں نے میٹرک کر لیا۔ اب میں ستر

سال کا ہو چکا تھا۔ مگر اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے بیس سال کا لگتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ مسلسل ورزش اور بہتر خوراک تھی۔

اب میں نے گلبرگ کے ایک جوڈو کراٹے سینٹر میں بھی داخلہ لے لیا تھا۔ میں اپنی دانست میں اپنے آپ کو ہر طرح اپنے والد اور بھائی کے قاتل سے انتقام لینے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ مجھے اپنی صحت بنانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

اس دوران میں مجھے جمیلہ سے عجیب سا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ہم ایک ساتھ پڑھتے تھے اور اب ہم نے نوجوانی کی حدود میں قدم رکھ دیا تھا۔ جمیلہ کی نگاہوں میں بھی میں نے اپنے لئے محبت کی رمق محسوس کر لی تھی۔ اس کے باوجود ہم دونوں نے ایک دوسرے سے اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ محبت شاید اظہار کی پابند بھی نہیں ہوتی۔

اسی عرصے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے میرے اندر خود اعتمادی پیدا کر دی۔ ہوا یہ کہ جب میں کالج سے لوٹ کر آیا۔ تو جمیلہ کو امی سے راز دارانہ انداز میں کچھ باتیں کرتے دیکھا۔ خلاف توقع جمیلہ کا تر و تازہ اور شاداب چہرہ مجھے اس وقت کچھ بجھا بجھا سا لگا۔ امی کے چہرے پر بھی فکر مندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اب میں بھی انہیں امی ہی کہتا تھا۔

"کیا بات ہے امی؟ کیا ہوا؟ جمیلہ کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے ان دونوں کے قریب جا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹا! کوئی ایسی خاص بات نہیں۔"

امی نے مجھے ٹالنا چاہا۔

"نہیں کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔"

میں بولا۔

"اپنے ابو کو آجانے دے' پھر بتا دوں گی۔"

انہوں نے کہا۔

میں ضد کرنے لگا۔ تو انہیں زبان کھولنا ہی پڑی میں نے ان سے جو کچھ سنا اسے سن کر میرا خون کھول اٹھا جب تک میں نے میٹرک نہیں کیا تھا جمیلہ میرے ہی ساتھ اسکول آتی جاتی تھی۔ لیکن اب گذشتہ تین مہینے سے اسے اکیلے اسکول آنا جانا پڑتا تھا۔ محلے ہی کا ایک لڑکا راشد گذشتہ دو مہینے سے جمیلہ کو تنگ کر رہا تھا۔ اور آج تو اس نے حد کر دی تھی۔ اس نے جمیلہ کو ایک پرچہ تھما دیا تھا۔ جس میں اظہار عشق کیا گیا تھا۔ وہ پرچہ پڑھ کر میں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور پھر تیزی کے ساتھ گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"فیروز!" امی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔ "کہاں جا رہا ہے بیٹا؟"

"میں اس کمینے راشد کے گھر جا رہا ہوں! اسے اتنی جرات کیسے ہوئی!" میں غصے میں بولا۔

"نہیں بیٹا' تو' تو نہ جا! تیرے ابو اس کے باپ سے بات کر لیں گے۔" امی نے مجھے سمجھایا۔

"نہیں امی' مجھے نہ روکیے!" میں دروازے کے قریب پہنچ کر رکا اور مڑ کر بولا۔

"میں اس آوارہ کے ہوش ٹھکانے لگا دوں گا! اس نے آخر سمجھا کیا ہے۔"

پھر اس سے پہلے کہ امی مزید کچھ کہتیں' میں گھر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

راشد کو میں جانتا تھا۔ محلے کے آوارہ لڑکوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ مجھ سے عمر میں وہ بڑا ہی تھا۔ دو سال سے سیکنڈ ایئر میں فیل ہو رہا تھا۔ عموماً وہ محلے کے دوسرے آوارہ منش نوجوانوں کے ساتھ نظر آتا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جمیلہ کو آتے جاتے چھیڑنے کی ہمت کرے گا۔

ایک گلی چھوڑ کر راشد کا گھر تھا۔ میں تیز قدمی کے ساتھ اس کی گلی تک پہنچ گیا۔ راشد اپنے دو دوستوں کے ساتھ مجھے گلی کے نکڑ ہی پر کھڑا مل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر چونک اٹھا ہے اس نے اپنے دوستوں سے بھی کچھ کہا تھا۔

قریب پہنچتے ہی میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا' پھر گریبان کو جھٹکا دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"تو نے جمیلہ کو پرچہ کیوں لکھا؟ بول!"

"گریبان چھوڑو میرا!"

راشد نے اپنا گریبان چھڑانا چاہا۔

"اگر اس نے تمہاری بہن کو لو لیٹر لکھ دیا تو کون سا ظلم ہو گیا۔ آخر تمہیں کسی نہ کسی کو تو اپنا بہنوئی بنانا ہی پڑے گا۔ پھر راشد میں کیا خرابی ہے؟" راشد کے ایک دوست نے چھچھورے انداز میں مجھ سے کہا اور پھر زور سے ہنس دیا۔ دوسرا دوست بھی اس کا ساتھ دینے لگا۔

اس کی بات سن کر میرا دماغ سلگ اٹھا۔ راشد کا گریبان چھوڑ کر میں اس کے دوست کی طرف مڑا۔ میرے گھونسے کی ضرب اتنی ہی شدید تھی کہ وہ چیخ اٹھا میرا گھونسا اس کے منہ پر پڑا تھا۔ اسی وقت راشد نے میرے پیٹ پر مکا مارا۔ جواباً میری لات اس کی پنڈلی پر پڑی۔ راشد کے دوسرے دوست نے بھی مداخلت کی اس نے میرے سر کے بال پکڑ کر کھینچ لئے۔ پھر ان تینوں سے میری باقاعدہ ٹھن گئی' مگر میں ان کے قابو میں نہ آیا۔ وہ چاہتے تھے۔ مجھے زمین پر گرا لیں۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس چاقو بھی ہو گا۔ جب گراری دار چاقو کھلنے کی آواز میں نے سنی تو اچھل پڑا۔ چاقو راشد کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں دوست دائیں بائیں تھے۔

مجھے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ ہمارے اردگرد بھیڑ ہو گئی ہے۔ راشد نے جب چاقو کھول لیا۔ تو بھیڑ میں سے کوئی چیخ اٹھا۔ "بس کرو راشد! چھوڑ دو اسے، خون خرابے کی ضرورت نہیں۔"

"ہرگز نہیں!"

راشد بھی جواباً چیخا۔

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا!"

وہ اب مجھ سے خاصا قریب آچکا تھا۔ میں اسی کا منتظر تھا۔ میں اچانک اپنی جگہ سے اچھلا اور پھر میرا دایاں پاؤں دائرے کی صورت فضا میں بلند ہوا۔ ادھر میری لات اس کے ہاتھ پر پڑی ادھر چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر میری طرف آیا۔ میں نے جھپٹ کر فضا ہی میں چاقو لپک لیا۔ راشد پر جوڈو کا ایک داؤ آزماتے ہوئے ہرچند کہ میرا یہ ارادہ نہیں تھا۔ کہ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر میری طرف آجائے اور میں اسے لپک لوں، مگر وہاں موجود لوگوں نے یقیناً ایسا ہی محسوس کیا ہو گا۔ جیسے میں نے دانستہ یہ سب کچھ کیا ہے۔

چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی ان تینوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"آؤ اب آگے بڑھو نا!"

میں نے چاقو لہرا کر انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔

"اچھا تو یہ لو! ..... میں تمہاری طرح بزدل نہیں کہ کسی نہتے شخص پر ہتھیار سے حملہ کروں۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے چاقو بند کر کے اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

وہ تینوں میرے ہاتھوں خاصی مار کھا چکے تھے۔ پھر بھی اتنے لوگوں کے سامنے اپنی ہتک برداشت نہ کر سکے۔ دوسرے ہی لمحے ان تینوں نے بیک وقت مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ ایک کے پیٹ پر میری

لات پڑی دوسرے کے شانے پر کھڑی ہتھیلی اور تیسرے کے منہ پر الٹا ہاتھ! دو تو کراہتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے مگر ایک جس کے منہ پر الٹا ہاتھ پڑا تھا۔ مجھ سے اپٹ گیا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر جچا تلا ہاتھ مارا تو وہ کسی مردہ مچھلی کی طرح دور جا گرا۔

راشد کے پیٹ پر میری لات پڑی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑے زمین پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر سر کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور پھر اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ اسی کے ساتھ میرا گھونسا اس کے پیٹ پر لگا اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نظر آنے لگے۔

"بول اب چھیڑے گا جمیلہ کو؟"

میں نے اس کے سر کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

اسی وقت راشد کے دونوں دوست اٹھ کر وہاں سے بھاگ لیے۔ ان دونوں میں شاید اب مزید میرے ہاتھوں مار کھانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ راشد نے غالباً اپنے دوستوں کے فرار ہو جانے کے بعد خود بھی اپنی شکست تسلیم کرلی۔ اس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی زبان سے بھی اقرار کیا۔

"مجھے معاف کر دو فیروز..... اب ..... اب کبھی میں جمیلہ کو نہیں چھیڑوں گا۔"

میں نے اس کے سر کے بال چھوڑ دیئے اور پھر پینٹ کی جیب سے چاقو نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔

"اگر تم اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو میں آئندہ تمہیں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔"

راشد ندامت سے سر جھکائے اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

"آج سیر کو سوا سیر ملا تو معلوم ہوا ان لوگوں کو!" وہاں موجود لوگ چہ

میگوئیاں کرنے لگے۔

"فیروز نے ان کے سارے کس بل نکال دیئے۔

مجھے احساس تھا کہ امی اور امی سے بھی زیادہ جمیلہ میری طرف سے فکر مند ہوگی۔ اس لئے مزید وہاں رکے بغیر گھر کی طرف واپس چل دیا۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ امی اور جمیلہ دونوں ہی دروازے پر کھڑی تھیں۔

"تم ..... تم نے بڑی دیر لگا دی بیٹے!" امی دروازے سے ہٹتے ہوئے بولیں۔ "وہ ملعون راشد مل گیا؟"

"ہاں امی!" میں دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ "وہ مل گیا اور آئندہ کے لئے اسے سبق بھی مل گیا۔ اب وہ کبھی جمیلہ کو چھیڑنے کی جرات نہیں کرے گا"۔

"آخر ہوا کیا فیروز؟ ہمیں بھی تو معلوم ہو!"

جمیلہ بھی بول اٹھی۔

وہ مجھے بچپن ہی سے نام لے کر مخاطب کرتی آئی تھی۔

"خاک ڈال لڑکی؟"

امی نے مداخلت کی۔

"بس تیرے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ اب وہ تیرے راستے میں نہیں آئے گا۔"

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں"

میں نے شرارت سے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "جاؤ اب جلدی سے میرے لئے کھانا لے آؤ' بہت زوردار بھوک لگ رہی ہے۔"

جمیلہ کو میں نے دانستہ امی کے سامنے کچھ نہیں بتایا تھا مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ مجھ سے پوری تفصیل معلوم کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گی۔ پھر یہ ہوا میں کھانا کھا کر کمرے میں لیٹنے گیا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

س نے آتے ہی کہا۔

"ہاں اب شروع ہو جاؤ! ورنہ....."

اس نے دھمکی دینے والے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ورنہ ملکہ عالیہ اپنے بادشاہ سلامت سے ناراض ہو جائیں گی۔"

میں نے اپنی عادت کے مطابق اسے چھیڑا اور بستر پر لیٹ گیا۔

"بکومت! تم کیوں ہونے لگے میرے بادشاہ سلامت!" وہ خجل سی ہو کر ولی۔

"کیوں کیا تمہارے لئے بادشاہ سلامت آسمان سے اتریں گے!" میں نے پنے جسم پر چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔

"کہیں سے بھی اتریں' تم کون!"

"اچھا تو ہم کوئی نہیں تو پھر جاؤ یہاں سے!"

"ہرگز نہیں! میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ جب تک تم مجھے ایک ایک بات نہیں بتا دو گے!"

اس نے میرے جسم سے چادر کھینچ لی۔ "میں تمہیں سونے نہیں دوں گی!"

پھر مجھے جمیلہ کی بات ماننا پڑی چاقو کا ذکر سن کر اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے تھے۔

میری پوری بات سن کر اس نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"اگر چاقو اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹ جاتا تو..... تو خدا نہ کرے بہت برا ہوتا میری خاطر تم نے اپنی زندگی ناحق خطرے میں ڈال دی تھی۔"

"یہ زندگی بھی تو تمہاری ہی ہے جمیلہ! تم سے زیادہ تو میری زندگی قیمتی نہیں۔" میں جذباتی ہوگیا۔

"پاگل ہو تم پورے!"

وہ ہنس دی اور پھر کمرے سے چلی گئی۔ دیر تک اس کی ہنسی میری سماعت میں گونجتی رہی۔

اس دن کے بعد راشد نے پھر کبھی جمیلہ کو نہیں چھیڑا جمیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ اگر کبھی آتے جاتے وہ مل بھی جاتا ہے تو راستہ بدل لیتا ہے۔ اس واقعہ نے میرے اندر خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ میرے کہنے پر امی اور جمیلہ نے وعدہ کر لیا تھا کہ ابو کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ محلے والے بھی اب مجھے عزت احترام کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ جس کا ثبوت میرے ساتھ ان کا رویہ تھا۔

اسی طرح دو سال اور بیت گئے۔ میٹرک کے بعد امی نے جمیلہ کو پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ ابو اسے مزید پڑھانے کے حق میں تھے۔ امی نے کہا تھا کہ ہمیں جمیلہ سے کون سی نوکری کرانا ہے جو آگے پڑھائیں وہ جمیلہ کو کالج بھیجنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ میں اب بی اے کے پہلے سال میں تھا۔ انٹر میں نے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اسی دوران' میں نے جوڈو کراٹے کی بھی مکمل تربیت حاصل کر لی تھی۔ میرے ذہن سے ابھی تک برسوں گزر جانے کے باوجود اپنے والد اور بھائی کے قاتل کا چہرہ محو نہیں ہوا تھا۔ اپنی اماں کو بھی میں نہیں بھولا تھا۔ معلوم نہیں وہ اب تک زندہ بھی تھی یا نہیں!

مزید ایک سال بعد میں نے بی اے کر لیا تو ابو ایک مشکل میں پھنس گئے۔ ان کے محکمے نے انہیں قبل از وقت ریٹائر کر دیا۔ یہ جبری ریٹائر منٹ ایک انکوائری کے تحت ہوا تھا۔ اس افسر نے اسی وجہ سے ابو کے خلاف رپورٹ لکھ دی تھی۔ ابو گریڈ گیارہ میں تھے۔ انہیں خاصا پروویڈنٹ فنڈ وغیرہ ملا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس رقم کو بیٹھ کر تو نہیں کھانا تھا۔

ابو کے آبائی گاؤں علی پور میں ان کی خاصی زمین تھی جو انہوں نے پٹے پر دے رکھی تھی۔ ابو علی پور آتے جاتے رہتے تھے۔ جبری ریٹائر منٹ کے بعد

ابو نے اپنے آبائی گاؤں علی پور ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہم خود ہی زمین پر کاشت کریں گے۔ تو زیادہ فائدہ ہو گا۔ امی بھی ابو سے متفق تھیں۔ صرف میں اور جمیلہ گاؤں جانے کے حق میں نہیں تھے۔ میں نے تو خیر اپنی عمر کا ابتدائی حصہ گاؤں میں گزارا بھی تھا۔ مگر جمیلہ کبھی گاؤں میں نہیں رہی تھی۔ وہ علی پور میں پیدا ضرور ہوئی تھی مگر اس نے لاہور ہی میں ہوش سنبھالا تھا۔ ابو کا کہنا تھا کہ علی پور پہنچ کر اپنے عزیز رشتے داروں میں جمیلہ کے لئے کوئی اچھا رشتہ تلاش کر لیں گے۔ اس بات نے جمیلہ کو اور خود مجھے بھی خاصا مضطرب کر دیا تھا۔ ہم دونوں نے تو جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

گھر میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک دن جمیلہ نے مجھے کمرے میں تنہا پا کر مجھ سے اپنا راز دل کہہ ہی دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے واضح الفاظ میں مجھ سے اظہار محبت کر دیا تھا۔

"خدا کے لئے فیروز' کسی طرح ابو کو سمجھاؤ کہ وہ علی پور کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔"

اس نے مجھ سے کہا۔

"کیوں' کیا مضائقہ ہے وہاں جانے میں!؟"

میں نے دانستہ کہا تھا' مقصد محض اسے چھیڑنا تھا' وہاں جا کر وہ تمہارے ہاتھ بھی پیلے کر دیں گے۔ تمہیں تو اس پر خوش ہونا چاہئے۔"

"فیروز! میں ..... میں تمہارے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی!؟"

وہ جذباتی ہو گئی۔

"میں تم ..... صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"تو پھر ہمت کرو' کہہ دو امی سے کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

میں شرارت سے مسکرایا۔

"یہ ..... امی سے یہ بات کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔"

وہ بولی۔

"تو پھر صبر کرو! اور جہاں ماں باپ شادی کر دیں قبول کر لو۔"

"مت کرو مجھ سے ایسی باتیں!"

وہ روہانسی ہو گئی۔

"میں موت قبول کر سکتی ہوں مگر تمہاری بجائے کسی اور کو قبول نہیں کر سکتی۔ فیروز! تم ..... تم امی یا ابو سے خود بات کرو نا!"

"پگلی لڑکی! تو کیا سمجھتی ہے کہ میں یوں اپنی دنیا لٹنے دوں گا! گھبرانے کی ضرورت نہیں میں آج ہی امی سے بات کر لوں گا۔"

"سچ فیروز؟" وہ جیسے کسی نازک کلی کی طرح کھل اٹھی۔

"ہاں سچ میری چندا، میری زندگی!"

میں نے اسے یقین دلایا اور وہ مطمئن ہو کر چلی گئی۔

جمیلہ کو تو میں نے مطمئن کر دیا تھا، لیکن خود مضطرب تھا۔ میرے دل میں انجانے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ معلوم نہیں امی اور ابو میری بات مانیں گے کہ نہیں!

جمیلہ اب بھرپور طور پر جوان ہو گئی تھی۔ جوانی اس پر ٹوٹ کر برسی تھی متناسب جسم، گھنی زلفیں، کتابی چہرہ، بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں، لمبا قد سرخ و سفید رنگ، تراشیدہ لب، ستواں ناک، حسین آنکھوں پر بڑی بڑی پلکیں اور چال تو قیامت تھی۔ جب وہ چلتی تو مجھے زمانہ ٹھوکریں کھاتا محسوس ہوتا اس کی چشم خمار پرور، بدن کی مینا اور لبوں کے ساغر نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔

میں نے اسی دن ڈرتے جھجکتے امی سے کہہ دیا کہ میں جمیلہ کو اپنا چاہتا ہوں۔

امی میری بات سن کر کچھ دیر چپ رہیں پھر انکار میں سرہلاتے ہوئے کہنے لگیں۔ "فیروز بیٹا، یہ ناممکن بات ہے، ایسا نہیں ہو سکتا!"

"مگر کیوں؟ ..... کیوں نہیں ہو سکتا امی؟ ..... کیا میں ..... میں جمیلہ کے قابل نہیں ہوں؟" میری آواز بھرا گئی۔

"یہ بات نہیں فیروز بیٹے، بات کچھ اور ہے۔"

"تو بتائیں نا امی کیا بات ہے؟" میں بے صبری سے بول اٹھا۔

"ہمارے ہاں برادری سے باہر لڑکی نہیں دیتے۔ ہم نے تو کبھی اس لئے سوچا بھی نہیں کہ جمیلہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جمیلہ کے ابو، علی پور میں اس کے لئے رشتہ ڈھونڈنے کی بات نہ کرتے"۔

امی کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

امی پر دباؤ ڈالنے کے لئے میں نے انہیں جمیلہ کے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا، پھر ان کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ اس سلسلے میں ابو سے بات کریں۔

"تم کہتے ہو بیٹے، تو میں ان سے بات کیے لیتی ہوں۔ مگر زیادہ امید نہ رکھنا۔" امی آخر مان ہی گئیں۔

"آپ ..... امی آپ تو راضی ہیں نا؟" میں نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز بھر آئی ہوئی تھی۔

"میں تو بیٹے، اپنے بچوں کی خوشی میں خوش ہوں۔ تم ..... تم بھی میری اولاد کی طرح ہو!" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلکنے لگے تھے۔

پھر اسی شب میں نے ابو کی تیز اور سخت آواز سنی۔ ابو نے جو کچھ امی سے کہا تھا اسے سن کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ رشیدہ! کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے! اس سے کہو کہ جمیلہ کے لئے ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں!"

☆ ☆ ☆

ابو کی آواز کے بعد کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں دم سادھے
کھڑکی سے لگا رہا۔ ابو نے میری اور جمیلہ کی قسمتوں کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ مجھے تو
نہیں تھی کہ اس کے بعد امی کچھ کہیں گی، لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ا
دھیمی آواز میں کہہ رہی تھیں "کیوں نہیں ہو سکتا۔ وہ جمیلہ کا سگا بھائی نہیں
ہے۔ جمیلہ نے بھی کبھی اسے بھائی نہیں کہا۔ وہ بچپن سے اسے نام لے کر پکار
ہے"۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے!" ابو کی آواز میں بدستور سختی برقرار تھی۔

"فرق پڑتا ہے اس سے! جمیلہ نے کبھی فیروز کو اپنا بھائی نہیں سمجھا ا
لیے تو وہ خود بھی فیروز کو اپنانا چاہتی ہے۔"

"کیا؟ ابو تقریباً چیخ اٹھے۔" اس کی اتنی جرات ہو گئی کہ اس نے تم
خود ایسی بات....."

"جمیلہ نے مجھ سے یہ بات نہیں کی۔" امی نے وضاحت کی۔ "مجھے

ی فیروز نے بتائی تھی"۔

"اگر یہ بات سچ بھی ہے اور واقعی جمیلہ ایسا چاہتی ہے تو یہ اس کی کم عقلی
۔ وہ ابھی بچی ہے اور خاندانی روایات سے ناواقف ہے مجھے حیرت ہے کہ تم
ہ کو سمجھانے کی بجائے مجھ سے ایک ایسی بات مان لینے کو کہہ رہی ہو جو کسی
رح بھی ماننا ممکن نہیں ہے! تمھی سوچو کہ خاندان والے اور عزیز رشتے دار کیا
ہیں گے!"

"آپ کہتے ہیں تو میں جمیلہ اور فیروز کو سمجھانے کی کوشش کروں گی"۔
ں نے اپنی ہار مان لی، مگر اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا میں بس یہ چاہتی
ں کہ آپ اس معاملے میں جلد بازی نہ کریں یوں بھی ابھی جمیلہ کی عمر ہی کیا
ے!

"ٹھیک ہے، میں جلدی نہیں کروں گا، لیکن علی پور پہنچنے کے بعد جمیلہ کا
ئی اچھا رشتہ آیا تو انکار بھی نہیں کروں گا"۔ ابو کسی قدر نرم پڑ گئے۔ ان کی
واز میں پہلے ایسی سختی نہیں رہی تھی۔

میں کھڑکی سے ہٹ آیا۔ دوسرے دن صبح موقع پاتے ہی جمیلہ نے مجھ سے
چھا تم نے بات کی امی سے؟

جواباً میں نے اسے سب کچھ بتا دیا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"تمہیں اداس ہونے کی ضرورت نہیں فیروز!" خلاف توقع جمیلہ پر اعتماد
جے میں بولی۔ اگر ابو اپنی ضد پر قائم رہے تو میں بھی اپنی ضد نہیں چھوڑوں گی!
ں بھی انہی کی بیٹی ہوں! وہ زبردستی کسی سے میری شادی نہیں کر سکتے! اگر امی
نے تمہارے کہنے کے مطابق اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات کی تو میں ان سے
ی یہی کہہ دوں گی۔ بیٹیوں کی مرضی و منشا معلوم کئے بغیر کسی سے ان کی شادی
ر دینا، یوں بھی ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔ زمانہ اب بہت بدل چکا ہے
روز! آج کی لڑکی اتنی بے بس و مجبور نہیں رہی کہ اپنے حقوق کے لئے آواز

نہ اٹھا سکے!"

میں، جمیلہ کے لہجے کی سرکشی سے ڈر گیا اور اسے سمجھانے لگا۔" جمیلہ والدین کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے"۔

میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی جمیلہ بول اٹھی۔ "تو کیا تمہیں اور جدا کر دینا بھلائی ہے؟" بولو! آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے تیزی آ گئی۔

"تمہاری خاندانی روایات بھی تو ہیں، ان سے کس طرح بغاوت کی ہے، بہرحال ابو نے امی سے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ اس سے قطع نظر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے جمیلہ کہ ہم پر احترام لازم ہے"۔ میرا انداز بدستور سمجھانے والا تھا۔

پھر خاصی دیر سمجھانے کے بعد جمیلہ کچھ نرم پڑی، مگر وہ کسی بھی قیم اپنے والدین کی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی اسی دن امی نے جمی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ میں بھی قریب ہی موجود تھا۔ ابو کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ جمیلہ کے لہجے میں سرکشی تو نہیں تھی مگر اس نے واضح میں کہہ دیا تھا کہ میرے سوا وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔

امی نے مجبوراً مجھ سے کہا تھا کہ تم ہی جمیلہ کو سمجھاؤ، یہ ضد چھوڑ د اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔

"میں سمجھا چکا ہوں اسے امی! مگر یہ کسی طرح میری بات ماننے پر ر نہیں۔ بہتر یہی ہے امی کہ آپ ایک بار پھر ابو کو سمجھانے کی کوشش کریں"

"ایک بار تو انہیں سمجھانے کی کوشش کر چکی ہوں فیروز بیٹے! تم کہتے دوبارہ ان سے بات کروں گی۔ خدا کرے وہ مان جائیں۔ امی بولیں، پھر کہنے لگیں تم دونوں کو دراصل اندازہ نہیں کہ اگر تمہاری شادی ہو گئی تو کے کیا نتائج ہوں گے! تمام برادری والے ہمیشہ کے لئے ہم سے قطع تعلق

لیں گے پھر وہ آئندہ ہم سے کوئی رشتہ نہیں کریں گے۔ خاندان میں تمہارے بچوں کی شادیاں نہیں ہو سکیں گی۔ سب یہ کہہ کر رشتہ لینے یا دینے سے انکار کر دیں گے کہ ہمارے خاندان میں ٹانکا لگ چکا ہے، یعنی ہم نے برادری سے باہر غیر لوگوں میں رشتہ کر دیا تھا۔

"تو کیا ہوا امی! میں جذباتی آواز میں بولا۔ ضروری تو نہیں کہ ہم اپنے بچوں کی شادیاں برادری ہی میں کریں"۔

"یہ کہنا آسان ہے فیروز بیٹے، لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے تمہیں ابھی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی لڑکی جوان ہو جاتی ہے اور اس کا رشتہ نہیں آتا تو ماں باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔ خیر..... قسمت میں جو لکھا ہے، وہ تو ہو گا ہی اللہ مالک ہے میں جمیلہ کے ابو سے بات کروں گی"۔

جس روز ہمیں لاہور سے علی پور کے لئے روانہ ہونا تھا ابو نے مجھے الگ کمرے میں لے جا کر بات کی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "فیروز بیٹے! تمہاری امی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ جمیلہ اور تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو میں تم دونوں کی خوشی کی خاطر اپنی برادری کا ہر ظلم سہنے کو تیار ہوں، مگر بیٹے فوری طور پر ایسا نہیں ہو سکتا۔ پہلے ہمیں علی پور میں اپنے پاؤں جمانا ہوں گے تاکہ برادری والے ہم سے قطع تعلق بھی کر لیں تو ہم پر کوئی اثر نہ پڑے۔ تم سمجھ رہے ہو، نا میری بات؟"

"جی..... جی ہاں ابو"! میں احتراماً نظریں جھکا کر بولا۔ حالانکہ ابو کی بات سن کر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا لیکن یہ وقت اس کے اظہار کا نہیں تھا۔

"فیروز بیٹے"! تمہیں جمیلہ کو اپنانے کے لئے انتظار کرنا پڑے گا۔ ابو نے نرمی سے کہا۔ "وہاں سیٹ ہونے میں ہمیں دو ایک سال تو لگ ہی جائیں گے"۔ میرا جی چاہا کہ کہہ دوں جمیلہ کو اپنا بنانے کی خاطر تو میں ساری زندگی

انتظار کر سکتا ہوں میں نے صرف اتنا کہا مجھے منظور ہے ابو۔

"جیتے رہو"۔ ابو نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر دعا دی' پھر نصیحت کی۔ "فیروز بیٹے! تم اور جمیلہ ایک ہی گھر میں اور ایک ہی چھت کے نیچے رہو گے۔ جس طرح اب تک تم دونوں نے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ایک دوسرے کو چاہتے ہو' اسی طرح آئندہ بھی رہنا! ان کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

میں ابو کی نصیحت کا مطلب سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتے تھے!

"آپ کو اور امی کو انشا اللہ ہم دونوں کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہو گی"۔ میں نے پر اعتماد لہجے میں انہیں یقیناً دلایا۔

"مجھے تم سے یہی توقع تھی بیٹے!" جمیلہ کو اس کی ماں سمجھا دے گی۔ ابو یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ کمرے سے چلے گئے تو میں سوچنے لگا کہ بغیر پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ شخص میں یہی فرق ہوتا ہے تعلیم یافتہ شخص آخر کار حقائق کو تسلیم کر لیتا ہے اور اس میں زمانے سے ٹکر لینے کی بھی ہمت ہوتی ہے۔ ابو اگر تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو وہ شاید اتنا بڑا قدم اٹھانے کا فیصلہ نہ کرتے۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ امی نے بھی اپنا کردار بہ خوبی نبھایا تھا۔ ابو کو راضی کرنے میں ان کا بھی یقیناً بڑا حصہ تھا۔

علی پور کے لئے روانہ ہونے سے پہلے ہی میں نے موقع دیکھ کر جمیلہ کو یہ خوش خبری سنا دی۔ وہ پہلے تو کھل اٹھی' پھر اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کر کمرے سے بھاگ گئی میں اسے آوازیں دیتا ہی رہ گیا۔

لاہور میں ہمارا گھر کرائے کا تھا۔ ابو نے مالک مکان کا گھر کی چابیاں دے دیں۔ اس سے پہلے گھر کا تمام سازو سامان ایک ٹرک میں لادا جا چکا تھا۔ ٹرک

کے علاوہ علی پور تک کے لئے ایک ویگن بھی کرائے پر حاصل کی گئی تھی امی' ابو جمیلہ اور میں ویگن میں بیٹھ گئے۔

ہم لوگ دوپہر کا کھانا کھا کے لاہور سے چلے تھے' شام ہوتے ہوتے علی پور پہنچ گئے وہ دن اور پھر اس سے اگلا دن گھر کی صفائی اور سامان سیٹ کرنے میں گزر گیا گھر خاصا بڑا تھا یہ ابو کا آبائی مکان تھا اور ظاہر ہے کہ ان کی ملکیت تھا۔

تیسرے دن صبح ابو مجھے ساتھ لے کر سب سے پہلے بڑی حویلی کی طرف روانہ ہوئے۔ ابو نے مجھے بتایا تھا کہ اس بڑی حویلی میں گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار ملک سرفراز کی سکونت تھی گاؤں آکر ابو پہلے ان کے سامنے حاضری دینا چاہتے تھے ابو نے مجھے بتایا تھا کہ ملک سرفراز ایک پڑھے لکھے سنجیدہ اور مشفق آدمی ہیں۔

بڑی حویلی کے مردانے حصے کی بڑی سی نشست گاہ میں ملک سرفراز سے ہماری ملاقات ہوئی وہ شخص خاصا بار عب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر پر بڑی سی سفید پگڑی تھی' رنگ گورا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں' مونچھیں بڑی اور گھنی تھیں۔ وہ جے پوری کوٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس شخص میں کچھ کشش محسوس ہوئی اور مجھے کچھ اپنا اپنا سا لگ رہا تھا نشست گاہ میں وہ تنہا نہیں تھا کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

"آ بھئی امجد! میں نے سنا ہے کہ تو اب نوکری چھوڑ چھاڑ کر مستقل طور پر گاؤں آگیا ہے بڑی خوشی ہوئی مجھے یہ سن کر! زمین تو کھینچتی ہے نا اپنی طرف! پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ پتر ہے تیرا نا!"

"نہیں ملک جی یہ میرے ایک مرحوم دوست کی نشانی ہے۔ اس کے والدین اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میری تو بس ایک بیٹی ہے" ابو نے بتایا۔

"تو پھر یہ بھی تیرے بیٹے ہی کی طرح ہوا نا! کچھ پڑھایا لکھایا بھی اسے؟

ملک سرفراز نے میری طرف دیکھتے ہوئے ابو سے پوچھا ویسے دیکھنے میں تو تعلیم یافتہ لگتا ہے"۔

آپ کا اندازہ درست ہے ملک جی! بی۔ اے کیا ہے اس نے

"بھئی امجد یہ تو مجھے خوش خبری سنا دی"۔ ملک سرفراز جانے کیوں یہ سن کر کہ میں نے بی اے کیا ہے' خوش نظر آنے لگا تھا۔

"وہ کیسے ملک جی"؟ ابو نے حیران ہو کر کہا۔

"یار اپنی ناہید بیٹا ہے نا' اس نے اسی سال فیصل آباد کے ایک کالج سے انٹر کیا ہے۔ روز اسے میری جیپ لاتی لے جاتی تھی۔ میں سوچ یہ رہا تھا کہ کسی طرح یہ روز کے آنے جانے کا ٹنٹا کٹ جائے کوئی ایسا شخص مل جائے جو حویلی ہی میں ناہید کو بی اے کی تیاری کرا دے اور میں اس سے پرائیویٹ امتحان دلوا دوں' مگر تجھے تو معلوم ہے کہ یہاں گاؤں میں ایسا کوئی آدمی کہاں مل سکتا ہے! میں نے کوشش کی تھی کہ فیصل آباد سے کسی بندے کو بلوا لوں جو یہاں حویلی ہی میں رہے' پر شہر چھوڑ کر آنے پر کون راضی ہوتا ہے! منشی اب بھی کوشش میں لگا ہوا ہے' لیکن اب میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تو اپنے گھر کا بچہ ہی مل گیا ہے۔ بول تو راضی ہے اس پر؟" ملک سرفراز نے ابو سے دریافت کیا۔

"اس کے لئے میرا خیال تو یہ تھا کہ ملک جی کہ یہ میرا ہاتھ بٹاتا لیکن آپ کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں! ہاں ...... اس سے پوچھ لیں"۔ ابو نے جواب دیا۔

ملک سرفراز نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے کہا! "جو ابو کا حکم ہے' میں اسی پر عمل کروں گا"۔

"لے بھئی امجد' گل مک گئی! ملک سرفراز پر مسرت آواز میں بولا۔ "تیرا پتر تو بڑا فرماں بردار لگتا ہے۔ ہاں نام کیا ہے پتر تیرا؟" ملک سرفراز مجھ سے مخاطب ہوا۔

"فیروز" میں نے بتایا۔

"تو فیروز پتر' آج سے تیری ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ سمجھ آئی! تیرا ا خرچہ پانی میں برداشت کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ ابو سے بولا اور بھئی امجد' ، اپنی زمین پر کاشت کے لئے جس چیز کی ضرورت ہو بلا جھجک کہہ دینا' کل یے فیروز کو حویلی بھیج دینا میں اسے ناہید سے ملوا دوں گا۔

"بہتر ہے ملک جی! فیروز آجائے گا۔ اب اجازت دیجئے!" ابو نے کہا۔

"ارے تو لسی مسی پئے بغیر کس طرح جاسکتا ہے"! یہ کہہ کر ملک سرفراز ، کسی ملازم کو آواز دی۔

ملازم آگیا تو ملک سرفراز نے اس سے لسی لانے کو کہا۔ ہر چند کہ وہ ملازم ں کچھ ہی دیر ٹھہرا تھا مگر نہ معلوم کیوں مجھے اس کی آنکھیں کچھ آشنا سی ں۔ اس کی آنکھیں کسی شکرے ایسی تھیں اور اس کے حلیہ سے لگا نہیں اتی تھیں۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے ترے چہرے پر سفید داڑھی تھی اور کاندھے پر رومال پڑا ہوا تھا۔ اگر کسی کی راس کی آنکھوں پر نہ پڑتی تو وہ ایک نیک اور شریف آدمی ہی معلوم ہوتا۔

کچھ دیر بعد جب وہ ایک سینی میں دو بڑے گلاس لسی سے لبالب بھرے ئے لے کر آیا تو ملک سرفراز نے اس سے کہا شیدے بہت سست ہوگیا ہے کام ںا۔

"معافی چاہتا ہوں ملک جی!"

شیدے ادب سے بولا۔ غالباً اس کا نام رشید ہوگا جو بگڑ کر شیدے ہوگیا ا۔

پھر لسی پینے کے دوران میں بار بار مجھے یہی خیال آتا رہا کہ شیدے کی نکھیں میر۔ ، لئے کیوں کچھ جانی پہچانی سی تھیں حالانکہ میں اس گاؤں میں پہلی ر آیا تھا۔

لسی پی کر ابو نے ملک سرفراز سے اجازت لی اور مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ حویلی سے نکل کر میں نے محسوس کیا کہ ابو گھر کی طرف نہیں جا ر تھے۔ میں نے ان سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی تو وہ بولے۔ "ہاں بیٹے! گھر سے نکلے ہی ہیں تو چوہدری افضل کی طرف بھی ہوتے چلیں ورنہ وہ مانے گا۔"

"یہ چوہدری افضل کون ہے ابو؟" میں نے معلوم کیا۔

"رشتے دار ہے اپنا!"

ابو نے جواب دیا' پھر کہنے لگے۔

"پچھلے سال میں اسی کی شادی میں شرکت کرنے علی پور آیا تھا۔"

"ہاں یاد آگیا۔" میں بولا۔ "آپ امی کو بھی ساتھ لانا چاہتے تھے مگر انہ نے انکار کر دیا تھا' یہ کہہ کر کہ بچوں کے' یعنی ہمارے پاس کون رہے گا؟"

"ملک جی کے بعد چوہدری افضل ہی کی زیادہ زمینیں ہیں' اس گاؤ میں۔"

ابو نے بتایا۔ "رشتے میں وہ بھتیجا ہوتا ہے میرا۔"

"پھر تو ابو خود اسے آپ سے ملنے آنا چاہئے تھا۔ رشتے میں تو وہ آپ چھوٹا ہوا نا!" میں نے کہا۔

"نہیں بیٹے! رشتے میں وہ مجھ سے چھوٹا سہی لیکن اصولی طور پر پہلے ہی اس سے ملنے جانا چاہئے۔" ابو بولے۔ "دیکھو بیٹے' جو شخص کہیں کسی شہر یا نئی بستی میں جاتا ہے تو یہ اس کی ذمے داری ہے کہ وہ لوگوں سے پہلے ملے۔"

میں نے اثبات میں سرہلا دیا۔ اب ہم جس راستے پر چل رہے تھے اس کے اختتام پر ایک بڑا سا پختہ مکان بنا ہوا تھا مگر یہ مکان' بڑی حویلی سے چھو تھا۔ جلد ہی ہم اس کے دروازے تک پہنچ گئے۔ اس مکان کے ملازمین ابو ک

پہچانتے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہماری رہنمائی کی اور پھر ہم مکان کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔

لمبا تڑنگا چوہدری افضل' ابو سے بہت خوش اخلاق کے ساتھ پیش آیا مگر جانے کیوں وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔

"دلہن بیٹا کیسی ہے؟" ابو نے چوہدری افضل کو مخاطب کیا۔

"وہ ایک بدکردار لڑکی تھی چاچا' میں نے اسے طلاق دیدی۔" چوہدری افضل نے بے جھجک جواب دیا۔ "طلاق کے بعد وہ اپنے گاؤں ڈگری واپس چلی گئی۔"

"دکھ ہوا بیٹے کہ تمہارا گھر بس کر پھر اجڑ گیا۔"

ابو کے لہجے میں تاسف تھا۔

"تو کیا ہوا چاچا' پھر بس جائے گا گھر' ابھی تمہارا بھتیجا بوڑھا تو نہیں ہوا' اب تم آگئے ہو تو مجھے کیا فکر! تمہی کوئی لڑکی تلاش کرو! تمہیں تو معلوم ہے کہ ابے کی موت کے بعد اور شادی سے تین مہینے پہلے اماں بھی مرگئی تھی ورنہ اب تک وہ میرے لئے نئی بیوی لے آئی ہوتی۔" پھر وہ قدرے چونکتے ہوئے بولا جیسے اسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔

"ہاں چاچا' تمہاری بھی تو ایک بیٹی تھی' اب تو وہ بھی جوان ہو گی نا!"

چودھری افضل نے جس انداز اور جس موقع پر جمیلہ کا ذکر کیا' اس سے میں سلگ اٹھا۔ بڑی ہی بے باکی اور بے ہودگی تھی اس کے لہجے میں۔ ابو کے چہرے پر بھی میں نے ناگواری کے اثرات دیکھے' مگر زبان سے انہوں نے ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور صرف

"ہاں"

کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے کہاں چل دیئے چاچا! ابھی تو شہناز سے بھی نہیں ملے تم! میں

اسے بلواتا ہوں۔ بیٹھو...... نا چاچا!"

اس نے ابو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مجبوراً ابو کو بیٹھنا پڑا۔ مجھے بھی وہاں اب مزید بیٹھنا گراں گزر رہا تھا لیکن ابو کی وجہ سے مجبور تھا۔ ابو پہلے ہی اس سے میرا تعارف کرا چکے تھے چودھری افضل کو بھی انہوں نے میرے بارے میں وہی بتایا تھا جو ملک سرفراز کو بتا چکے تھے۔ تعارف کے بعد اس نے میرے لئے جو جملہ استعمال کیا تھا' وہ غیر شریفانہ تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "تو یوں کہیں نا چاچا کہ یہ تمہارا لے پالک ہے"۔

جواباً ابو بولے تھے کہ نہیں یہ میری اولاد کی طرح ہے۔ چودھری افضل ابو کو سنجیدہ دیکھ کر اس سلسلے میں پھر کچھ نہیں بولا تھا۔

لسی کے لئے ابو نے منع کر دیا کیونکہ چودھری افضل اپنے ایک ملازم کو بلا کر لسی لانے کے لئے کہہ رہا تھا۔

"اچھا تو پھر تم چھوٹی بی بی کو بھیج دو یہاں۔ ان سے کہنا کہ لاہور سے امجد چاچا آئے ہیں۔" چوہدری افضل نے ملازم کو حکم دیا۔

"بہت بہتر سرکار!" ملازم یہ کہہ کر چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد ایک نوجوان خوب صورت لڑکی وہاں آ گئی اور اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا وہ کسی بھی طرح گاؤں کی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ وہ جینز اور جیکٹ زیب تن کئے ہوئے تھی اور شانوں پر لمبے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔

"ہیلو امجد چاچا! کیسے ہو؟" وہ آتے ہی ابو سے مخاطب ہوئی۔

"ٹھیک ہوں بیٹا! تم کیسی ہو؟" ابو نظریں جھکا کر بولے۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم اب یہیں گاؤں آ گئے ہو چاچا' کیا یہ خبر درست ہے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"ہاں بیٹا' تم نے ٹھیک سنا ہے"۔ ابو اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

"پھر تو میں تمہارے گھر ضرور آؤں گی چاچا! چاچی سے بھی ملوں گی آ کر!
و..... تمہاری بیٹی بھی تو تھی نا ایک..... کیا نام تھا اس کا....."

"جمیلہ" ابو نے بتایا۔ "تم ضرور آنا گھر!"

"تم نے اسے کچھ پڑھایا لکھایا تو ہو گا نا چاچا!"

"ہاں میٹرک کرا دیا تھا' آگے اس کی ماں نے نہیں پڑھنے دیا۔"

"یہ بڑا ظلم ہے لڑکیوں پر! حیرت تو یہ ہے کہ خود عورتیں یہ ظلم کرتی
۔ میں نے تو بی اے کر لیا ہے۔ آپ کو تو خبر ہے چاچا کہ ہمارے گاؤں کے
کتنے بیک ورڈ ہیں۔ انہوں نے اور خاص طور پر ہمارے عزیز رشتے
وں نے اس پر بڑی ناک بھوں چڑھائی مگر نہ افضل نے ان کی کسی بات پر
دھرا' نہ میں نے انہیں لفٹ دی میں نے تو افضل سے کہہ دیا ہے کہ میرے
شہر کا کوئی پڑھا لکھا لڑکا ڈھونڈنا اور جب میں اسے پسند کر لوں تو اس سے
ی شادی کرنا کیوں بھائی افضل؟" اس نے تصدیق کے لئے چودھری افضل کی
دیکھا۔

شہناز ٹھیک کہتی ہے چاچا!" چودھری افضل نے اپنی بہن کی تصدیق کی۔
تو اس بات کے بھی خلاف ہوں کہ شادی برادری ہی میں کی جائے۔ پڑھ
کر ہمیں ایسی فرسودہ باتیں زیب نہیں دیتیں تمہارا کیا خیال ہے چاچا!"

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا' مگر بزرگوں کی روایات کو ہم اس طرح ایک دم نظر
از تو نہیں کر سکتے نا!"

ہر چند کہ چودھری افضل کی باتوں سے میں بھی متفق تھا مگر اس کے لئے
ی ناپسندیدگی اپنی جگہ برقرار رہی۔ اس کی بہن شہناز بھی مجھے پسند نہیں آئی
صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ چودھری افضل سے عمر میں چھوٹی تھی مگر بڑی
تکلفی سے "بھائی صاحب" یا "بھائی جان" کہنے کی بجائے اپنے بڑے بھائی کا
لے رہی تھی۔

"چاچا! یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

شہناز میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ابو سے مخاطب ہوئی۔

"اسے میرا بیٹا ہی سمجھو۔"

ابو نے یہ کہہ کر میرا پورا تعارف کرا دیا۔

"ویری سیڈ!" شہناز کے لہجے میں افسوس کے بجائے بناوٹ تھی پھر وہ راست مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ فیروز! یہاں آکر تو اب تک ہر جگہ خا مدارات میں تمہیں لسی ہی پینے کو ملی ہو گی' آؤ میرے ساتھ' میں تمہیں ا ہاتھ سے عمدہ سی چائے بنا کر پلاتی ہوں کم آن!" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہو

"نو تھینکس!" میں نے دانستہ انگریزی بولی۔

اوہ مائی گڈنیس!" وہ پر مسرت مگر قدرے طنزیہ لہجے میں بولی۔

"تمہیں تو انگریزی بولنا بھی آتا ہے!"

میں نے اس کے لہجے کی چبھن کو محسوس کرتے ہوئے کہا

"یس! آئی ایم آلسوا ے گریجویٹ!"

"ونڈرفل! یہ بہت اچھا ہوا کہ اس گاؤں میں ایک اور گریجوٹ کا اض ہو گیا۔ اچھا تو اب اٹھو' تکلف نہ کرو!" اس نے آگے بڑھ کر بے تکلفی میرا ہاتھ تھام لیا۔ یوں جیسے میرے اور اس کے درمیان مدتوں کی جان پ ہو۔ اسے اپنے بڑے بھائی کی وہاں موجودگی کا بھی خیال نہیں تھا اور یہ ب میرے لئے تعجب خیز تھی۔

اس سے پہلے کہ جواباً میں کچھ کہتا' ابو بول اٹھے۔ "نہیں شہناز بیٹا' ا ہمیں جانے ہی دو! گھر سے چلے ہمیں بہت دیر ہو گئی ہے تمہاری چاچی ہما واپسی کا انتظار کر رہی....."

"تو پھر ایسا کریں چاچا کہ آپ چلے جائیں"۔

شہناز' ابو کی بات پوری ہونے سے پہلے بولی۔

"یہ بعد میں آجائیں گے"۔ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

"مگر فیروز تو آج پہلی مرتبہ میرے ساتھ گھر سے نکلا ہے بیٹی' اسے تو گھر کا تہ بھی معلوم نہیں ہو گا"۔ ابو نے عذر کیا۔

"آپ تو فیروز کو بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہے ہیں چاچا!" شہناز ہنستے ئے کہنے لگی۔

"میں انہیں کسی ملازم کے ساتھ بھیج دوں گی یا پھر خود ساتھ لے آؤں "۔

ابو خاموش ہو گئے تو میں نے چائے پینے سے معذرت چاہی' مگر شہناز نہیں ں۔ بہ مجبوری ابو کو اکیلے ہی گھر لوٹنا پڑا۔

کسی گاؤں میں تو کیا شہر میں بھی ایسی تیز و طرار اور بے باک لڑکی کم ہی ھنے میں آتی ہے جیسی شہناز تھی۔ ابو چلے گئے وہ مجھے اپنے ساتھ گھر کے رونی حصے میں لے گئی۔

"فیروز! پہلے میں تمہیں اپنی لائبریری دکھاتی ہوں"۔ شہناز میرے ساتھ تھ چلتے ہوئے بولی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے خاتون' مگر آپ میرا ہاتھ تو چھوڑ دیجئے۔ یقین کریں میں ؤں گا نہیں"۔ میں مسکرا کر بولا اور پھر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"کسی کا ہاتھ تھام کر چھوڑا نہیں جاتا' سمجھے تم!" اس نے بھی مسکرا کر ا۔

"مگر یہ کام مردوں کا ہے خاتون' خواتین کا نہیں! آپ....."

"یہ تم نے آپ آپ' کیا لگا رکھی ہے بھئی! سیدھی طرح بات کرو' میں ی بوڑھی نہیں ہوں' عمر میں تم سے کم ہی ہوں گی"۔ اس نے میری بات ٹ کر کہا۔

"اگر یہ آپ کا حکم ہے تو پھر مجبوراً مجھے اس کی تعمیل کرنا پڑے گی"۔

"ویری گڈ! تم خاصی فرماں بردار قسم کی چیز معلوم ہوتے ہوا"۔

یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔

"تم جس لڑکی کے نصیب میں لکھے گئے ہو وہ خوش نصیب ہی ہو گی"۔

"ایک تو یہ کہ میں کوئی "چیز" نہیں آدمی ہوں' دوم یہ کہ......"

"سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم کہتے ہو تو میں تمہیں آدمی ما ہوں۔ ویسے تم نے انسان ہونے کا دعویٰ نہیں کیا' یہ کیوں؟"

"میرے نزدیک انسان اور آدمی میں فرق ہوتا ہے اور آدمی کو انسا بننے بڑی دیر لگتی ہے۔" غالباً اسی لئے مرزا غالب نے کہا تھا کہ "آدمی میسر نہیں انساں ہونا"۔

"لگتا ہے کہ تمہیں بھی میری طرح مطالعے کا شوق ہے۔ میرے پا اچھا کلیکشن ہے اردو شعراء کا!"

"میں نے غالب کی جس غزل کا مصرع پڑھا ہے' وہ کورس میں تھ کوئی خاص مطالعہ نہیں میرا' شوق بھی نہیں"۔ میں نے صاف گوئی سے بتا

"مطالعہ بہت ضروری چیز ہے فیروز!" اس نے کہا۔

"کتابیں لکھنے والے اپنی عمر کا بڑا حصہ کتابیں لکھنے پر صرف کر د جنہیں ہم خاصے مختصر وقت میں پڑھ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کا تجربہ اور ہمارے احساس اور علم کا حصہ بن جاتا ہے۔ تمہاری نظر میں کیا یہ ا نہیں؟ زندگی کو پوری طرح سمجھنے اور اسے برتنے کے لئے مطالعہ بہت ض ہے"۔

شہناز کی بات میں وزن تھا جس نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے اسی کی تائید کی۔

کچھ ہی دیر میں' شہناز کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو رہا صاف ستھرا تھا اور اپنی آرائش کے اعتبار سے خوب صورت بھی! وہاں

دیواروں سے لگی ہوئی کئی ایسی قد آدم الماریاں دیکھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ الماریاں یقیناً خاص طور پر کتابوں ہی کے لئے بنوائی گئی ہوں گی۔ لکڑی کی ان الماریوں کے دروازوں میں شیشے لگے ہوئے تھے کمرے کے وسط میں ایک میز پڑی تھی جس کی اطراف کرسیاں تھیں میز سے ہٹ کر ایک جانب دو آرام کرسیاں نظر آ رہی تھیں جن کے درمیان چھوٹی سی ایک میز تھی۔ شہناز مجھے ساتھ لئے انہی آرام کرسیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ان میں سے ایک کرسی پر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسری کرسی پر خود بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو جناب' یہ ہے میری لائبریری! کہو تمہیں کیسی لگی؟"

"خوب صورت ہے"۔ میں نے اعتراف کیا۔"اس سے تمہارے ذوق مطالعہ کا بھی پتا چلتا ہے اور نفاست کا بھی!"

"اس بات پر چائے ہو ہی جائے!" وہ ہنس کر بولی۔

"ویسے تو اپنے ایک ملازم کو میں نے چائے بنانا سکھا دی ہے مگر تم پہلی بار آئے ہو اس لئے....."۔

اسی وقت کمرے کے دروازے کی جانب سے کسی کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور شہناز اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر دیکھنے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک دراز قد ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ملازم ہو گا اس کا اندازہ میں نے اس کے حلیئے سے لگایا۔ وہ کسرتی اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک نوجوان تھا۔ اس کا ناک نقشہ بھی برا نہیں تھا۔ اگر اسے ڈھنگ کے کپڑے پہنا دیئے جاتے تو وہ خاصی پرکشش شخصیت کا مالک نظر آتا۔

"چائے بنا کر لاؤں بی بی جی؟" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی شہناز کو مخاطب کیا اور پھر میرا جائزہ لینے لگا جو مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

"نہیں فیض رہنے دو۔ ویسے میں ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی۔ عمر بڑی ہے تمہاری! دراصل ان کے لئے میں خود اپنے ہاتھ سے چائے بنانا چاہتی

ہوں"۔

"اگر یہ چائے بنا سکتا ہے تو کیا حرج ہے!"

میں بول اٹھا۔

"تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے پھر کبھی سہی۔"

"ڈیو رہی تو پھر ٹھیک ہے۔"

اس نے کہا' پھر ملازم سے مخاطب ہوئی۔

"دیکھو چائے عمدہ ہونا چاہئے۔ یہ میرے مہمان ہیں اور پہلی بار یہاں آئے ہیں"۔

"بہتر ہے بی بی جی!"

یہ کہتے ہوئے اس نے پھر میری طرف دیکھا اور کمرے سے چلا گیا۔

میں نے اپنے لئے اس ملازم کی آنکھوں میں واضح طور پر ناپسندیدگی محسوس کی تھی حالانکہ یہ اس سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس ناپسندیدگی کی و میری سمجھ میں نہیں آسکی۔

"اچھا یہ بتاؤ فیروز! مجھ سے دوستی کرو گے؟"

اچانک شہناز نے مجھ سے ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

"دوستی!" میں حیرت سے بولا۔ "کیا تمہیں نہیں معلوم شہناز کہ ہمار معاشرے میں لڑکے اور لڑکی کی دوستی کو لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے!"

"معاشرے اور لوگوں کو گولی مارو' تم اپنی بات کرو یار!"

"میں خود بھی تو اسی معاشرے کا ایک فرد ہوں۔"

"یعنی تم بھی اسے اچھا نہیں سمجھتے؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"حیرت ہے' تم پڑھے لکھے نوجوان ہو کر ایسی بیک ورڈ بات کر رہے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور تم لڑکی اور لڑکے کی دوستی پر اعتراض

ہے ہو! کیا مغرب میں لڑکیوں کے بوائے فرینڈز نہیں ہوتے؟"

"مگر یہ مغرب نہیں ہے' مشرق ہے۔ یہ لندن یا نیو یارک نہیں' پنجاب کا ب گاؤں ہے۔ مشرق کی اپنی تہذیب اور اپنی روایات ہیں۔"

"تہذیب و روایات کا مطلب کنویں کا مینڈک بن جانا تو نہیں ہوتا نا! علوم نہیں تم کس دنیا میں رہتے ہو! اب مشرق و مغرب کے فاصلے سمٹ چکے ں۔ ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اس میں دنیا سمٹ سمٹا کر بہت چھوٹی ں رہ گئی ہے۔ تہذیب اب ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی ہیں اور اس عمل کوئی روک نہیں سکتا" شہناز خاصی پرجوش نظر آنے لگی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم ڈیبیٹ وغیرہ میں خاصا حصہ لیتی رہی ہو۔"

میں نے ہنس کر اس کی بات ٹالنا چاہی اور موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر لا۔

"کیا تم یہی لباس پہن کر گھر سے باہر بھی نکلتی ہو۔؟"

"اگر میں گاؤں میں یہ لباس پہن کر نکل جاؤں تو یہاں کے پینڈو مجھے دیکھ ر پاگل ہو جائیں۔" اس نے جواب دیا۔

"بس گھر میں شوق پورا کر لیتی ہوں یا پھر کبھی لاہور وغیرہ جانا ہوتا ہے ب!"

اسی وقت شہناز کا ملازم فیض چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ا۔

"یہاں ادھر میز پر رکھ دو!" شہناز نے اسے مخاطب کیا۔

ملازم میز پر چائے رکھ کر چلا گیا۔ چائے پینے کے دوران میں بھی ہمارے رمیان باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک شہناز نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی کسی کی سے عشق کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے شہناز کہ ہم ایک دوسرے کی ذات کو موضوع گفتگو نہ

بنائیں تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"اس میں اتنے سنجیدہ ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ دوستی میں ایسی باتیں ایک دوسرے سے پوچھ ہی لیا کرتے ہیں۔ تم اگر مجھ سے ایسا کوئی سوال کرتے تو میں تمہیں جواب ضرور دیتی۔"

"تمہاری بات اور ہے۔ میرے اور تمہارے انداز فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"مگر زمین اور آسمان کہیں جا کر ایک دوسرے سے مل بھی تو جاتے ہیں۔"

"وہ فریب نظر ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔"

"میرے نزدیک عشق کرنا کوئی جرم نہیں۔ میں اسے فطری سمجھتی ہوں۔ نہ میں اس موضوع پر گفتگو کرنے کو مخرب اخلاق تصور کرتی ہوں۔ میرا انداز فکر یہی ہے اور یقیناً یہی انداز فکر حقیقت سے قریب تر ہے۔ کیا تم کسی سے عشق کرنے کو غیر فطری سمجھتے ہو؟"

"میں بھی عشق کو تمہاری طرح ایک فطری عمل سمجھتا ہوں لیکن اس موضوع پر کسی دوشیزہ سے گفتگو کرنے کو مناسب نہیں سمجھتا۔ معاف کرنا میرے نزدیک یہ بے حیائی ہے۔" میں نے بے جھجک کہہ دیا۔

"تو کیا تم مجھے بے حیا سمجھتے ہو؟" اس کا لہجہ بدل گیا۔

"میں نے تمہیں تو بے حیا نہیں کہا۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میری بات کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔" میں نے اس کا بدلا ہوا لہجہ دیکھ کر کہا۔

"تم خاصے ڈفیکلٹ ہو فیروز!"

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ "تمہاری جگہ اگر میں نے یہ سوال کسی اور نوجوان سے کیا ہوتا تو وہ جواباً اب تک خود مجھ سے اظہار عشق کر

چکا ہوتا۔"

"میں ان میں سے نہیں ہوں۔ اچھا اب خاصی دیر ہو گئی ہے' تم مجھے اپنے کسی ملازم کے ساتھ میرے گھر بھیج دو' ابو فکر مند ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"دیکھو کل میں کسی وقت تمہارے گھر آؤں گی۔" وہ بولی اور پھر اپنے اسی ملازم کو آواز دینے لگی جو چائے بنا کر لایا تھا۔

آواز دیتے ہی وہ ملازم فوراً ہی کمرے میں آگیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ کہیں قریب ہی موجود تھا۔ ممکن ہے کمرے کے باہر ہی کھڑا ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اس نے میرے اور شہناز کے درمیان ہونے والی پوری گفتگو سن لی ہو۔ مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی۔

"فیض! انہیں امجد چاچا کے گھر چھوڑ آؤ! ان کا گھر تو دیکھا ہے نا تم نے؟" شہناز اپنے ملازم سے مخاطب ہوئی۔

"جی ہاں بی بی جی دیکھا ہے۔" ملازم نے جواب دیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جب میں اس ملازم کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا تو اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہا۔

"بابو جی! آپ کے بھلے کو ایک بات کہوں؟"

"ہاں ہاں بولو' کیا بات ہے؟" میں نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"بی بی جی کی باتوں میں مت آنا جی!"

"کن باتوں میں؟"

"یہی جی دوستی ووستی کے چکر میں۔"

اس نے وضاحت کی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتی ہیں؟"

"میں جی آپ دونوں کی باتیں باہر کھڑا سن رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

"یہ تو بڑی بری بات ہے! کسی کی باتیں یوں چھپ کر نہیں سنا کرتے۔" میں بولا۔ "اگر تمہاری بی بی جی کو یہ معلوم ہو جاتا پھر؟"

"چھوڑیں جی! جب معلوم ہو جاتا تو دیکھی جاتی۔ میں تو آپ کے بھلے کو سمجھا رہا تھا' آگے آپ جانیں۔ بی بی جی پہلے بھی ایک نوجوان سے دوستی کا چکر چلا چکی ہیں۔ وہ فیصل آباد میں بی بی جی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ بی بی جی اسے گاؤں بھی اپنے ساتھ لانے لگیں۔ چوہدری جی نے بی بی جی کو بڑی آزادی دے رکھی ہے' مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔ جب پانی' سر سے اونچا ہونے لگتا ہے تو پھر چوہدری جی وہی کرتے ہیں جو اس نوجوان کے ساتھ ہوا۔"

"کیا ہوا اس نوجوان کے ساتھ؟" میں نے پوچھا۔

ملازم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میرے استفسار پر بہ مشکل وہ بولا۔

"بابو جی! کسی کو بتانا مت کہ ..... کہ میں نے آپ کو یہ بات بتائی ہے۔" اس کا لہجہ مزید رازدارانہ ہو گیا۔

"تم بتاؤ تو سہی! میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"ہوا یہ جناب کہ ایک دن جب وہ نوجوان رات کو یہاں رہ کر صبح واپس فیصل آباد جا رہا تھا تو .... تو وہ .... وہ قتل کر دیا گیا۔"

ملازم نے محتاط الفاظ میں چوہدری افضل کا نام لئے بغیر مجھے شہناز کے کلاس فیلو کے قتل کی بابت بتا دیا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس نوجوان کو کس نے قتل کرایا ہو گا!

ملازم کی بات سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے اسی وقت دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کبھی شہناز کے گھر نہیں جاؤں گا۔ ملازم مجھے میرے

ھر کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسرے دن صبح جب میں' ابو کے ایک کارندے کے ساتھ ملک سرفراز ی حویلی کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے دھول اڑاتی ہوئی ایک جیپ آتی ھائی دی۔ میں کچے راستے کی ایک طرف ہو گیا۔ جیپ جب قریب آئی تو میں نے ڈرائیور کے علاوہ اگلی نشست پر ایک اور شخص کو بھی بیٹھے ہوئے دیکھا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ وہ شخص اسی طرف بیٹھا تھا جدھر میں کھڑا تھا تاکہ یپ گزر جائے تو آگے بڑھوں کیونکہ راستہ تنگ تھا۔

دھول اڑاتی جیپ ایک زناٹے کے ساتھ میرے قریب سے گزر گئی اور ں' بندوق بردار شخص کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ اسی ایک جھلک نے یرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔ مجھے برسوں پہلے کی ایک ہولناک ات یاد آ گئی۔ وہ بھیانک رات جب میرے والد اور چھوٹے بھائی کو ایک بے حم و سفاک قاتل نے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا یہ میرا ریب نظر تھا یا پھر جیپ میں وہی قاتل چہرہ موجود تھا؟ وہی چہرہ جس کی مجھے ایک ھرسے تلاش تھی! یہ سوچتے ہوئے میرے سینے میں انتقام کا الاؤ دہکنے لگا۔

☆ ☆ ☆

وہ قاتل چہرہ تو بارہ سال کی عمر سے میرے صفحہ ذہن پر ثبت تھا۔ اسے بھلا کس طرح بھول سکتا تھا! میرے لئے تو اس کی ایک جھلک ہی کافی تھی۔ سرخ گول گول چھوٹی آنکھیں، گھنی مونچھیں اور بائیں رخسار پر زخم کا نشان! میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اسی چہرے کی تو ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس باوجود میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ کہاں جہلم کا ایک گاؤں کہاں فیصل آباد کی یہ بستی! ان دونوں کے درمیان کیا ربط، کیا تعلق تھا؟ سوال کا جواب سوچنے کے باوجود میرے ذہن میں نہ آسکا۔

میں اپنی سوچ میں گم کھڑا ہوا تھا۔ کہ ابو کے کارندے نے مجھے مخا کیا۔ "باؤ جی! آئیں چلیں"۔

"ہاں..... ہاں چلو۔"

میں چونک کر بولا، پھر بوجھل قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

ے ساتھ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں دوسرے ہی لمحے ارندے سے مخاطب ہوا۔

"ابھی جو جیپ گئی ہے۔ اس میں ڈرائیور کے قریب اگلی سیٹ پر ایک خص بندوق ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ کیا تم اسے پہچانتے ہو؟" یہ سوال کرتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔

"نہیں باؤ جی!"

کارندے نے جواب دیا۔

"میں اسے نہیں دیکھ سکا، پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں، وہ کون ہو گا!"

کارندے کی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ وہ اس شخص کو دیکھے بغیر بھلا یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ کون ہو گا! پھر یہی بات زبان پر آگئی۔

"تم کس طرح بتا سکتے ہو؟"

"میں جی، اس جیپ کو پہچانتا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"وہ جیپ ملک خوشی محمد کی تھی اور جس کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے وہ شخص ملک خوشی محمد ہی کا کوئی کارندہ ہو سکتا ہے۔"

"ملک خوشی محمد کون ہے؟ کیا وہ بھی اسی گاؤں میں رہتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں جی، وہ یہاں نہیں رہتے۔ ملک خوشی محمد قریبی گاؤں کنجاہ کے بڑے زمیندار ہیں۔"

ملک خوشی محمد! مجھے یاد آگیا کہ میرے والد اور بھائی کے قاتل بھی کسی "ملک جی" ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے "ملک جی" ہی کے حکم پر وہ سب کچھ کیا تھا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے جن لوگوں کی تلاش ہے، وہ قریبی گاؤں ہی میں موجود ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تقدیر مجھے وہاں لے آئی تھی۔ ہر

مجھے اب تک اپنے والد اور بھائی کے قاتل کا نام نہیں معلوم ہو سکا تھا
س کا حلیہ ایسا تھا کہ اسے تلاش کر لینا مشکل ثابت نہ ہوتا۔ میں نے فیصلہ
کہ جلد از جلد قریبی گاؤں جاکر اس قاتل کا سراغ لگاؤں گا۔ اپنی ماں کا
بھی مجھے اسی سے مل سکتا تھا۔ میری ماں کو اغوا کر کے وہ لوگ کہاں اور
لے گئے تھے؟ اب وہ کہاں اور کس حال میں تھی؟ زندہ بھی تھی یا نہیں؟
نام سوالوں کے جواب وہی قاتل دے سکتا تھا۔ میں اسے قتل کرنے سے
سب کچھ پوچھ لیتا۔ مجھے یہ خوف نہیں تھا کہ پہچان لیا جاؤں گا۔ ظاہر ہے کہ
چہرہ اب کسی بارہ سالہ بچے کا چہرہ نہیں تھا۔ پھر یہ کہ میرا نام بھی بدل چکا

میں ان ہی خیالوں کے بھنور میں ڈوبتا! ابھرتا ملک سرفراز کی حویلی تک
لیا تھا۔ "آجا پتر' میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر
و مجھے اپنے ساتھ حویلی کے اندرونی حصے میں لے گیا۔
حویلی کا اندرونی حصہ بھی بیرونی حصے کی طرح صاف ستھرا اور سامان
ئش سے مزین تھا۔ میں ملک سرفراز کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔
ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچانک ملک سرفراز نے مجھے مخاطب کیا۔ "پتر
ز! میری یہی ایک بیٹی ہے ناہید' اس کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ ماں بھی اس کی
ہی ہے۔ حویلی میں اکیلی رہتی ہے' شاید اس لئے چپ چپ سی رہتی ہے۔
ائی کے ساتھ ساتھ تم کو کوشش کرنا کہ وہ کچھ ہنسے بولے بھی! میں کبھی مجبورا
اس کے سامنے آتا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں بچپن ہی سے میرا خوف اس کے
میں بیٹھ گیا ہے۔ تم سے ہو سکے تو اس خوف کو بھی اس کے دل سے نکالنے
کوئی تدبیر ضرور کرنا"۔
"ضرور ضرور ملک جی' آپ مطمئن رہیں۔"
میں نے انہیں یقین دلایا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی وہ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کمر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس کے تذبذب کو محسوس کرلیا۔ غالباً وہ اس کم میں میرے ساتھ جانے سے جھجک رہا تھا۔ معاً وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "و میں نے ناہید سے تمہارے بارے میں کل ہی کہلوا دیا تھا مگر چاہتا تھا کہ خو سے تمہارا تعارف کرا دوں...... خیر آؤ!"

وہ فیصلہ کن انداز میں آگے بڑھا۔

میں بھی ملک سرفراز کی تقلید میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں د ہوا۔ خلاف توقع اس کمرے میں ایک اوسط عمر کی عورت نظر آئی جو ایک ہاتھ میں لئے وہاں موجود ایک سینٹرل ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ لباس مجھے کوئی ملازمہ ہی معلوم ہوئی۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ کھڑی ہوگئی۔

"نذیراں! تیری چھوٹی بی بی کہاں ہیں؟"

ملک سرفراز نے اس عورت کو مخاطب کیا۔

"وہ ..... ملک جی وہ اپنے کمرے میں ہیں۔"

عورت کی مردہ سی آواز سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ملک سرفر سامنے بولتے ہوئے خوف کھا رہی ہو۔

"کیا تو نے نہیں بتایا کہ آج سے پڑھنا ہے؟ تیری چھوٹی بی بی کو وقت یہاں ہونا چاہئے تھا!"

"جی ملک جی مگر....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"مگر کیا؟ بولتی کیوں نہیں!" ملک سرفراز کے لہجے میں سختی آگئی۔

"انہوں نے ..... چھوٹی بی بی جی نے کہا تھا کہ ممکن ہے آپ .... بھی ملک جی ..... آپ خود ماسٹر جی کو لے کر یہاں آئیں اس لئے ..... بی جی نے کہا تھا کہ جب ..... جب آپ یہاں سے چلے ......"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، سمجھ گیا میں!"

ملک سرفراز خوف زدہ ملازمہ کی بات کاٹ کر بولا۔

"میں جا رہا ہوں یہاں سے، بلا لا اپنی چھوٹی بی بی کو!" پھر وہ مجھ سے طب ہوا۔

"فیروز پتر! تم بیٹھو یہاں! ابھی ناہید آجاتی ہے۔ میں چلتا ہوں۔ جب جاؤ تو ے سے ملتے ہوئے جانا، میں مردانے میں ملوں گا۔ تمہیں"۔

یہ کہہ کر ملک سرفراز دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی کے پیچھے ملازمہ ی تھی۔

میں اس کمرے میں تنہا رہ گیا تو ناہید کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ لڑکی مجھے یب لگی جو اپنے باپ کا سامنا کرنا نہیں چاہتی مگر ایسا بھی کیا ڈر! یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی ممکن ہے وہ کوئی ایسی وجہ ہو، شعوری طور پر جس کا علم ود ناہید کو بھی نہ ہو۔ بہرحال ناہید کی آمد تک میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

ناہید کی آمد کا مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا اس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر میرے مقتول والد سے مشابہہ تھا۔ اس کے عقب میں ملازمہ کتابیں اٹھائے ہوئے آرہی تھی۔ میں حیرت زدہ سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے جب مجھے سلام کیا تو میں عالم حیرت سے نکل کر چونک اٹھا اور اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ جمیلہ کی ہم عمر لگتی تھی۔ خوب صورت بھی بہت تھی، مشرقی حسن کا شاہکار! وہ قمیض شلوار پہنے ہوئے تھی اور سینہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔

ملازمہ نے میز پر کتابیں رکھ دیں اور پھر چلی گئی۔ وہ کمرہ نشست گاہ معلوم ہو رہا تھا۔ سینٹرل ٹیبل کی دونوں جانب دو دو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ انہی

میں سے ایک پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ناہید دوسری جانب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ناہید جی!"

میں نے اسے مخاطب کیا۔ پڑھائی کل سے ہوگی' آج ہم صرف کریں گے تاکہ ایک دوسرے کے بارے میں کچھ جان سکیں"۔ یہ کہتے ہ میری نظریں اس کے حسین چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "اس پر آپ کو اعتراض تو نہیں؟"

"جھکی ہوئی لمبی پلکیں اوپر اٹھیں اور پھر وہ بولی۔ "جیسا آپ کہیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"تو پہلے میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ میرا نام فیروز احمد ہے۔ یہاں گاؤں میں آئے ہوئے مجھے ابھی چند روز ہوئے ہیں۔ میں یہاں لاہور سے ہوں۔ وہیں لاہور ہی میں بی اے کیا تھا میں نے' یہاں آنے کے بعد ملک نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اس پر مجبور کر دیا کہ میں آپ کو آکر پڑھایا کر سو حاضر خدمت ہوں۔" مختصراً اپنا تعارف کرا دیا' پھر بولا۔

"اب اپنا تعارف کرا دیں"۔

"مم ...... میں ...... میرا تعارف!" وہ کچھ نروس سی نظر آنے لگی۔ ...... کیا آپ کو میرے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم؟"

"کچھ تو معلوم ہے' مگر زیادہ نہیں' مثلاً یہ کہ آپ اپنے والد سے ا خوف زدہ کیوں رہتی ہیں؟"

"نن..... نہیں تو ایسی ...... ایسی تو کوئی ...... کوئی بات نہیں۔"

وہ رک رک کر نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ مجھے اس کے چہرے پر کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

"ایسی بات ہے!" میں زور دے کر بولا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کمرے میں میری منتظر ہوتیں"۔

"پلیز! آپ ..... آپ یہ ..... یہ موضوع نہ چھیڑیں!" اس کا لہجہ التجائیہ

"ٹھیک ہے' آپ کہتی ہیں تو میں اس موضوع پر بات نہیں کرتا' ہاں رف اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ملک جی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں"۔

جواباً وہ کچھ نہ بولی میرے لئے یہ بات انتہائی حیران کن تھی۔ کہ اس کا رہ میرے والد سے بڑی حد تک ملتا جلتا تھا۔ خاصی دیر ہم دونوں میں سے کوئی ی نہ بولا پھر اسی نے خاموشی توڑی۔ وہ مجھ سے لسی کے لئے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں شکریہ! میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔" میں نے معذرت کرلی اور اس نے اصرار نہیں کیا۔ پھر مجھے اس کی مرحومہ والدہ کا خیال آگیا اور میں نے یوں بر سبیل تذکرہ پوچھ لیا۔

"آپ کی والدہ کے انتقال کو کتنے دن ہو گئے؟"

"پانچ سال ہو گئے ہیں مگر..... مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہے۔" جواب دیتے ہوئے ناہید کی آواز بھرا گئی۔

"اپنی موت سے پہلے کیا وہ بیمار رہتی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ ..... وہ بیمار ہی رہتی تھیں مگر انہیں ایک ایسی بیماری تھی جس کا لاج شاید ممکن نہ تھا۔" ناہید عجیب سے لہجے میں بولی۔ "مجھے تو یہ حیرت تھی کہ ہ..... وہ یہاں زندہ کیسے تھی؟"

"یہاں سے کیا مراد ہے آپ کی؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"کچھ ...... کچھ بھی نہیں ...... کچھ بھی تو نہیں۔" ناہید کچھ سٹپٹا سی گئی۔ ں جیسے اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جسے نہیں نکلنا چاہئے تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی مگر کیا اور کیوں' میں نہیں جان سکا۔ میں نے سوچا کہ آئندہ چند روز میں رفتہ رفتہ اس سے سب کچھ معلوم کرلوں گا۔ اس کے رویے اور باتوں نے میرے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا۔

مزید کچھ دیر بیٹھ کر اور آئندہ روز صبح آنے کے لئے کہہ کر میں نے ا سے رخصت کی اجازت چاہی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے نہیں روکا تھا۔ ا حویلی کے مردانے حصے کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ناہید اور شہ میں کتنا فرق ہے! ایک ہی گاؤں کی دو نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے سے قط مختلف تھیں۔ ایک مجسم حیا تھی تو دوسری بے حیائی کی منہ بولتی تصویر!

حویلی کے مردانہ حصے میں پہنچ کر میں ملک سرفراز سے ملا جو اپنی نشست میں اپنے چند کارندوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر اس کارندوں کو وہاں سے چلے جانے اور شام کو آنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے اپنے قریب بٹھا لیا۔ اور بولا۔ "فیروز پتر! وہ کچھ ہنسی بولی؟" اس کے لہجے حسرت سی تھی۔

"آج تو پہلا دن تھا ملک جی' انشاء اللہ جلد ہی میں اپنی کوشش کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"پتر! اگر تو نے اس کے دل سے میرا ڈر نکال دیا تو میں تیرا یہ اح ساری زندگی یاد رکھوں گا۔" ملک سرفراز کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

"وہ ..... وہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔"

ملک سرفراز کی بات مجھے عجیب سی لگی۔ مجھے اس نے بظاہر اپنی بیٹ پڑھانے کے لئے ملازم رکھا تھا۔ مگر وہ مجھ سے ایک اور ہی کام لے رہا تھا۔

"میں پوری کوشش کروں گا ملک جی کہ ناہید کے دل سے آپ کا خ نکال دوں۔" میں نے اسے یقین دلایا' پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"ملک جی! اگر آپ بھی اسے سلسلے میں میری کچھ مدد کریں تو میرا آسان ہو جائے گا۔ میرے خیال میں اس خوف کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور مجھ سے بہتر آپ وہ وجہ جان سکتے ہیں۔ آپ کے خیال میں ناہید کے خوف وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"پتر فیروز! مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ ...... کہ میرے اور تمہارے ن ہونے والی گفتگو کا علم کسی تیسرے شخص کو نہیں ہو گا۔"

یں نے اس کی بات سنے بغیر وعدہ کر لیا۔

"بات یہ ہے پتر فیروز کہ ناہید کی ماں سے میری کبھی نہیں بنی۔ یوں سمجھ لو کسی منہ زور گھوڑی کی طرح تھی جس کی لگامیں مجھے ہمیشہ کھینچ کر رکھنا یں۔ ناہید نے جب سے ہوش سنبھالا' یہی سب کچھ دیکھا۔ جہاں تک میرا ہے' اس کے ذہن پر اسی کا اثر ہے۔" ملک سرفراز نے بتایا۔

"اب میں سمجھ گیا۔" میں بولا

"ناہید کو یقیناً اپنی ماہ سے محبت تھی۔ وہ اسی وجہ سے اپنی ناں کے ساتھ پ کا سخت رویہ دیکھ کر آپ سے ڈرنے لگی ہو گی۔"

"تم ٹھیک نتیجے پر پہنچے ہو' پتر فیروز! میرا بھی یہ اندازہ ہے۔ ممکن ہے اس ا نے بھی ناہید کے دل میں میرا خوف بٹھا دیا ہو۔" ملک سرفراز نے کہا۔ ناہید مجھ سے دور رہے۔"

"ہو سکتا ہے ملک جی!" میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔

"اگر واقعی ایسا ہی ہے تو ناہید کے دل سے آپ کا خوف نکالنے میں بڑی ہو گی' پھر بھی میں ناامید نہیں ہوں۔"

"خدا تمہیں جیتا رکھے پتر!" ملک سرفراز شفقت سے بولا اور پھر اس نے لوٹ کی جیب سے نوٹوں کی ایک نئی گڈی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

"لو پتر یہ رکھ لو۔"

"یہ کیا ملک جی! یہ تو بہت لگ رہے ہیں۔ ابھی تو پہلا ہی دن ہے مجھے!"

"زیادہ نہیں ہیں' رکھ لو! ایک ہزار ہیں مہینہ پورا ہونے پر مزید ایک ہزار ا جائیں گے۔ تمہیں! اس کے علاوہ تمہارے کپڑوں وغیرہ کی ذمہ داری پر ہو گی۔"

"مگر ملک جی، اتنی رقم تو بہت ہے۔"

پھر میں نے لاکھ منع کیا مگر ملک سرفراز نے میری بات نہیں مانی مجبور نوٹوں کی گڈی لینا ہی پڑی۔

"تم اکیلے گھر چلے جاؤ گے کہ کسی کو ساتھ کر دوں؟" ملک سرفراز سے چلتے وقت پوچھا۔

"چلا جاؤں گا ملک جی! آتے وقت راستہ میں نے ذہن میں رکھا تھا۔ نے جواب دیا۔

حویلی سے گھر کی طرف واپس جاتے ہوئے جب میں اس جگہ پہنچ آتے ہوئے جیپ نظر آئی تھی۔ تو میری آنکھوں میں وہی سفاک و قا گھوم گیا جو مجھے جیپ میں دکھائی دیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کنجاہ جا صورت ہو؟" وہ گاؤں میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اس کے علاوہ مجھے راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ ابو کو سب کچھ بتا دوں خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ حقیقت کا علم ہونے کے بعد مجھے وہاں نہ جانے دیتے میں نے فیصلہ کیا کہ کسی کو کچھ بتائے بغیر مجھے خود دشمن کا سراغ لگانا ہو گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں مطمئن ہو گیا۔

میں گھر پہنچا تو وہاں چوہدری افضل اور اس کی بہن شہناز کو دیکھ رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ دوسرے ہی دن وہ دونوں بہن بھائی ہما دھمکیں گے گھر میں ابو نہیں تھے۔ وہ زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ مجھے شہناز کھل اٹھی۔

"تمہاری واپسی ہی کا انتظار کر رہی تھی میں۔" شہناز چہکی، آمیز لہجے میں بولی۔"

تم نے کل بتایا نہیں کہ یہاں آتے ہی ڈیوٹی سے لگ گئے ہو! نے اسے یہ بات بتائی ہو گی۔

"ہاں بس ذہن میں نہیں رہا۔" میں بولا اور امی کی طرف دیکھنے لگا جو قریب ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر مجھے کشیدگی کے سے آثار نظر آ رہے تھے۔ جمیلہ وہاں نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے امی کو ان دونوں بہن بھائیوں کی آمد گراں گزری ہو۔

"ارے چاچی، یہ جمیلہ تو اندر ہی جا کر بیٹھ گئی میں نے تو بس ہنسی میں ایک بات کہہ دی تھی وہ تو بھا افضل سے سچ مچ اس طرح چھپ گئی جیسے یہ ....."

"کیوں، کیا ہوا! مجھے بھی تو معلوم ہو!" میں نے چونک کر شہناز کی بات کاٹ دی۔

"بھئی ہونا کیا تھا! میں نے چاچی سے کہہ دیا تھا۔ کہ اگر کہو تو جمیلہ کو اپنی بھابی بنا لوں بس یہ سنتے ہی جمیلہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئی۔" شہناز نے بتایا۔

"چلو اگر ایسا ہو بھی تو ابھی کون سا رشتہ ہوا ہے جو وہ مجھ سے پردہ کرنے لگی!" چودھری افضل بھی بول اٹھا بات کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر شیطانی سکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"میرا خیال ہے چودھری صاحب کہ ایسی باتیں نہ کریں یوں بھی اس وقت ابو گھر پر نہیں ہیں"۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو کیا ہو گیا! تم تو موجود ہو بڑے بھائی کی حیثیت سے تم بھی بات کر سکتے و"۔ چودھری افضل ڈھٹائی سے بولا اور اس کی بات سن کر میرا خون کھول ٹھا۔

"کیسی بات؟" میں بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"یہی اپنی بہن جمیلہ کے رشتے کی بات اور کیا! چاچا امجد تمہیں بھی تو اپنی ولاد کی طرح سمجھتے ہیں"۔

"تم تو پھیل ہی گئے بھا افضل"۔

میرے چہرے پر شہناز نے شاید ناگواری کے اثرات دیکھ لئے تھے اسی لئے اپنے بھائی سے اس نے یہ بات کہی تھی۔ وہ مزید بولی"۔

تم کیوں ان شریف لوگوں کو تنگ کر رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے تمہیں شادی وادی نہیں کرنا ورنہ ....."

"بس چپ رہو!"

چودھری افضل نے اپنی بہن کو کوئی بات کہنے سے روک دیا۔

"لو چپ ہو گئی"۔ شہناز ہنس کر بولی۔"

لیکن بھا افضل تم بھی اب اول فول نہیں بکو گے ورنہ تم جانتے ہو' میں ایک منٹ میں تمہارا بھانڈا پھوڑ سکتی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"آج شام کو میرا لانگ ڈرائیو کا موڈ ہے' تیار ملنا! میں تمہیں گھر سے لے لوں گی یا اگر چاہو تو ذرا پہلے ہماری طرف آجاؤ"۔

"مگر مجھے تو ابھی زمینوں پر ابو کے پاس جانا ہے"۔ میں نے عذر کیا۔ "وہاں سے دن مندے ہی واپسی ہو گی۔ میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔"

"ابھی سے اتنا نخرا دکھانے لگے!" چودھری افضل درمیان میں بول اٹھا ملک سرفراز کے یہاں تو صبح اٹھتے ہی دوڑ لئے تھے۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"مگر بھا افضل' ملک سرفراز سے فیروز کو پیسے بھی تو ملیں گے"۔ شہناز کی آواز میں بھی چبھن تھی۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے چودھری افضل دوبارہ کہنے لگا۔ "تو کیا ہوا! ہم بھی اسے ملازم رکھ سکتے ہیں' پیسے دے سکتے ہیں!"

"چودھری صاحب!" میں کوشش کے باوجود اپنی آواز نیچی نہ رکھ سکا۔ میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں' آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے!"

"بکاؤ مال نہیں ہو تو پھر یونہی بڑی حویلی چلے گئے تھے! جتنی حیثیت

آدمی کی اتنی ہی بات کرنا چاہئے!"

"اب چھوڑو بھی بھا افضل!"۔ شہناز نے کہا۔

"ابھی یہ نیا نیا گاؤں آیا ہے اور اسے معلوم نہیں کہ چودھری کی کسی بات سے انکار کا مطلب کیا ہوتا ہے!" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ان دونوں بھائی بہن کو جانے سے نہ امی نے روکا نہ میں نے۔ وہ چلے گئے تو میں' امی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"عجیب لوگ ہیں یہ بھی!"

"ہاں"

امی سر ہلا کر بولیں۔ "آتے ہی ان دونوں نے جمیلہ سے فضول بات شروع کر دی تھی۔"

"خاک ڈالیں ان پر!"

پھر جمیلہ کی تلاش میں بیرونی کمرے سے گھر کے اندرونی حصے میں آگیا۔ جمیلہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ وہ بڑی مشکل سے نارمل ہوئی' وہ بھی اس وعدے پر کہ میں اب کبھی ان لوگوں سے نہیں ملوں گا نہ ان کے گھر جاؤں گا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ خود ابو ہی مجھے ان کے گھر لے گئے تھے۔

"مجھے اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا کمینہ کہیں کا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نگل جائے گا"۔ جمیلہ منہ بنا کر بولی۔

"تم ہو ہی ایسی!" میں نے اسے چھیڑا۔ اس بے چارے کا بھی زیادہ قصور نہیں ہے۔"

"بکواس نہ کرو!" وہ شرما سی گئی۔

یوں شرماتے ہوئے وہ مجھے بہت اچھی لگی۔

شام کو ابو گھر آئے تو میں نے ملک سرفراز سے ملنے والے روپے انہیں

دے دیئے اور بتایا کہ مزید ایک ہزار ایک مہینے بعد ملیں گے۔ ابو نے امی کو آواز دے کر وہاں بلا لیا اور ان سے بولے۔ "لو بھئی' اپنے بیٹے کی پہلی کمائی رکھ لو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے نوٹوں کی گڈی امی کو دیدی۔

"ابو! ناہید کو پڑھانے کے بعد میں بھی زمینوں پر آپ کا ہاتھ بٹانے آجایا کروں گا"۔ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "یہاں گھر میں پڑے پڑے کیا کروں گا!"

"اگر تمہاری یہی مرضی ہے فیروز بیٹے تو ٹھیک ہے۔ میں کل کسی کو یہاں بھیج دوں گا کہ تمہیں ساتھ لے آئے"۔ ابو بولے۔ "ابھی تو تم نے زمینیں بھی نہیں دیکھیں"۔

"میرا ارادہ یہ بھی تھا ابو کہ یہاں آس پاس جو گاؤں ہیں' ان کی بھی سیر کر لوں"۔ میں اصل موضوع پر آگیا۔ دراصل ابو کے پاس زمینوں پر جانے کا میرا یہی مقصد تھا۔

"ہاں ہاں' کیوں نہیں!"

ابو نے میری تائید میں کہا' پھر بولے۔ "تم کل سے ایسا کیا کرنا بیٹے کہ دوپہر کا کھانا کھا کر میرے لئے اپنے ساتھ کھانا لے کر آجایا کرنا! ٹھیک ہے نا؟"

"جیسا آپ کا حکم ہو ابو! آپ کہتے ہیں تو میں دوپہر کو آجایا کروں گا"۔ یہ کہہ کر میں نے ابو کو چودھری افضل اور شہناز کی آمد کے بارے میں بتایا اور دبے لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا۔ ابو نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

"ان لوگوں سے زیادہ رسم و راہ بڑھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اچھے لوگ نہیں ہیں وہ۔" ابو نے کہا۔ "وہ رشتے دار ضرور ہیں مگر اس قابل نہیں کہ ان سے ملا جائے۔"

امی نے بھی ابو کی تائید کی۔

"ویسے تو مجھے تم پر بھرپور اعتماد اور بھروسا ہے بیٹے' پھر بھی تمہیں یہ ت ضرور کروں گا کہ ملک سرفراز کی حویلی میں بھی تمہیں بہت محتاط رہنا ، خصوصاً اس کی بیٹی ناہید کے معاملے میں!" ابو نے کہا۔

"ناہید تو بڑی نیک اور شریف لڑکی ہے ابو! شہناز سے قطعی مختلف ہے۔" نے بتایا۔

"وہ یقیناً ایسی ہی ہو گی جیسی تم بتا رہے ہو! مگر...... مگر ملک سرفراز کو تم ں جانتے"۔ ابو کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"ٹھیک ہے ابو' میں محتاط رہوں گا"۔ میں نے ابو کو یقین دلایا۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کر کے میں اکیلا ہی بڑی حویلی پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ ، سرفراز اپنی زمینوں کے معائنے پر گیا ہے۔ مجھے اسی کمرے میں بٹھا دیا گیا ں گزشتہ روز ناہید سے ملاقات ہوئی تھی۔ جلد ہی ناہید بھی وہاں آگئی۔ آج خوفزدہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک سرفراز اس ت حویلی میں نہیں تھا۔ سرخ شلوار سوٹ میں وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ ، اعتراف ہے کہ میں اسے دیکھ کر کچھ دیر کو مبہوت سا ہو گیا۔ وہ واقعی بے ا حسین تھی۔ اگر مجھے جمیلہ سے عشق نہ ہوتا تو میری دوسری پسند وہی ہوتی۔ لوم نہیں کیوں خود بخود میرا دل اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے ر کرسی پر بیٹھ گئی۔ آج بھی ملازمہ ہی اس کی کتابیں اٹھا کر لائی تھی۔

"اچھا تو ناہید' جی آج سے پڑھائی شروع کرتے ہیں' کیا خیال ہے؟" میں ے اسے مخاطب کیا۔

"نیک خیال ہے"۔ اس نے خلاف توقع خوش مزاجی سے جواب دیا۔

"آج آپ کچھ خوش خوش سی دکھائی دے رہی ہیں"۔ میں بولا۔ "وجہ یا ہے اس کی؟"

"اس کی وجہ آپ ہیں"۔ اس نے یہ کہہ کر نظریں جھکا لیں۔ "معلوم

نہیں کیوں جی چاہتا ہے کہ آپ پر بھروسا کرلوں!"

"کس معاملے میں؟" میں نے پوچھا۔

"ہر معاملے میں"۔ جواباً اس نے کہا اور نظر اٹھائی۔

"اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی سمجھ سکتا ہوں۔"

"کل آپ نے پوچھا تھا کہ میں اپنے ابو سے کیوں ڈرتی ہوں؟ میں کے اس سوال کا جواب دے سکتی ہوں مگر اس شرط پر کہ آپ کسی کو بات نہیں بتائیں گے۔ بولیں کرتے ہیں وعدہ؟"

"وعدہ رہا!" میں جلدی سے بول اٹھا۔ "یقین کریں ناہید جی' میں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔"

پھر ناہید نے مجھے جو کچھ بتایا اسے سن کر میں کانپ اٹھا۔ میرے تو گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ ملک سرفراز اتنا بے رحم اور ظالم شخص ہو نے مجھ سے اس بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا کہ تم ملک سرفراز کو نہیں جا وہ بات بھی یاد آئی کہ جو ملک سرفراز نے ناہید کی ماں کے متعلق مجھ تھی۔ اس نے اپنی بیوی کے بارے میں مجھ سے کہا تھا' یوں سمجھ لو کہ منہ زور گھوڑی کی طرح تھی جس کی لگامیں مجھے کھینچ کر رکھنا پڑتی تھیں نے جب سے ہوش سنبھالا' یہی سب کچھ دیکھا۔

ناہید کی داستان سن کر میں سوچ رہا تھا کہ بقول ملک سرفراز ایک گھوڑی سہی لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا' اس پر کوڑے برسائے اسے بھوکا پیاسا رکھا جاتا' اس سے نفرت کی جاتی! اگر واقعی ایسا ہی تھ اچھی عورت نہیں تھی تو ملک سرفراز اسے طلاق بھی دے سکتا تھا۔ پھر ایسا کیوں نہیں کیا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب نہ میرے پاس تھا اس کا کوئی جواب دے سکی۔ ناہید نے بتایا تھا کہ حویلی میں اس کی ماں ک ملازماؤں سے بدتر تھی نہ اسے اچھے کپڑے میسر تھے نہ اچھا کھانا! اس پر

تشدد الگ تھا جو اسے کم و بیش ہر روز ہی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ناہید ہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک سرفراز کی ایک اور بیوی بھی تھی جس سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اس کی ماں سے ایک سال پہلے مرگئی تھی۔ اس کے ساتھ بھی ملک سرفراز کا رویہ اچھا تھا کیوں کہ وہ بانجھ تھی۔ سوکن ہونے کے باوجود وہ ناہید کی ماں پر ہونے والے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھی۔ نتیجتاً اسے بھی ملک سرفراز کی لاتیں اور گھونسے کھانا پڑتے تھے۔

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ ملک سرفراز کے بارے میں یہ سب کچھ سننے کے بعد ناہید کے دل سے اس کا خوف یا نفرت ختم کرنے کی کوشش کرتا' پھر بھی میں نے کہا۔ "مگر ناہید! ملک جی تم سے محبت کرتے ہیں"۔

"لیکن میں ..... میں ان کی صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنی ماں کے جسم پر پڑنے والے کوڑے یاد آجاتے ہیں اور میرے کانوں میں ان کی دلدوز چیخیں گونجنے لگتی ہیں"۔

میں سمجھ گیا کہ ملک سرفراز جسے خوف کا نام دے رہا تھا' وہ دراصل نفرت تھی۔ ناہید اپنے باپ سے نفرت کرتی تھی اور اس کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ میں نے اسی لئے ناہید سے اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا۔ ملک سرفراز کی مجبوری محبت تھی کیونکہ ناہید اس کی اکلوتی بیٹی تھی اور ناہید کی مجبوری نفرت تھی۔ میں ناہید کی نفرت کو محبت میں تبدیل نہیں کرسکتا تھا۔

"اس روز بھی سارا وقت باتوں ہی میں نکل گیا۔ میں بس کچھ دیر ناہید کو پڑھا سکا' وہ بھی بے دلی کیساتھ! ناہید بھی پڑھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس روز مجھے ناہید کے اصرار پر لسی پینا ہی پڑی اور پھر میں واپس اپنے گھر آگیا' دوپہر کو ابو کا ایک کارندہ مجھے لینے آگیا' میں اس وقت تک کھانا کھا چکا تھا۔ ابو کیلئے روزانہ وہی کارندہ کھانا لینے آتا تھا۔ میں اس کے ساتھ زمینوں کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس سے میں نے پوچھا۔

"یہ گنجاہ یہاں سے کتنی دور ہوگا؟"

☆ ☆ ☆

"دس بارہ میل تو ہو گا ہی جی! ویسے مجھے زیادہ ٹھیک معلوم نہیں، بشیرے کو صحیح معلوم ہو گا، اس کی دھی بیاہی ہے کنجاہ میں"۔ کارندے نے بتایا۔

کارندے کی بات سن کر میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے کارندے سے بشیرے کی بابت پوچھا۔

"بشیرے کی ڈیوٹی ٹیوب ویل پر ہوتی ہے جی!" کارندے نے جواب دیا۔

یہ بات بھی مجھے پہلی بار معلوم ہوئی کہ ہماری زمینوں پر ٹیوب ویل بھی ہے۔ کارندے کے ساتھ میں زمینوں پر پہنچا تو ایک کھیت میں ابو کو ٹریکٹر چلاتے ہوئے دیکھا۔ مجھے آتا دیکھ کر ابو نے ٹریکٹر روک دیا اور پھر اس سے اتر کر میری طرف بڑھ آئے۔ کھانا کھانے کے بعد ابو نے کچھ دیر ایک پیڑ کے نیچے چادر بچھا کر آرام کیا، پھر اٹھتے ہوئے مجھ سے بولے۔ "آؤ میں تمہیں اس علاقے کی سیر کراتا ہوں"۔

ابو کے ساتھ وہاں گھومتے ہوئے مجھ بڑا سکون سا محسوس ہوا۔ شہر کے ں کی نسبت گاؤں کا یہ پر سکون ماحول مجھے بہت پسند آیا۔ ابو مجھے ٹیوب بھی لے گئے اور بشیرے سے ملایا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اس کی ں بتیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔

"تم ایک بیٹی ..... میرا مطلب ہے کہ شادی شدہ بیٹی کے باپ بھی ہو ، کیا یہ بات درست ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"پچھلے مہینے تو جی میں نانا بھی بن چکا ہوں"۔ اس نے اس طرح کہا جیسے یہ فخر کی بات ہو۔

"دراصل گاؤں دیہات میں شادیاں جلدی کر دی جاتی ہیں اس لئے یہ جلد دادا نانا بن جاتے ہیں۔" ابو نے ہنس کر کہا۔ "مگر تم بشیرے کو کس جانتے ہو؟"

"میرے ساتھ جو کارندہ آیا تھا، اسی سے معلوم ہوا تھا۔" میں جواباً بولا۔ میں نے دراصل اس سے آس پاس جو گاؤں ہیں، ان کے بارے میں تھا۔ میں نے کل آپ سے کہا تھا نا کہ اردگرد جو گاؤں ہیں ....."

"یاد ہے مجھے! کنجاہ تو تم بشیرے کے ساتھ ہو آنا مگر یہ سوچنا پڑے گا کہ ں جگہ کسے یہاں کام پر لگایا جائے!" ابو بولے۔

"بڑی مہربانی ہو گی جی، اگر آپ بس ایک ہی روز کو مجھے اپنی دھی سے انے دیں۔ میں نے تو ابھی اپنی نواسی کو بھی نہیں دیکھا۔" بشیرے، ابو سے نہ لہجے میں کہنے لگا۔

"بس جی ایک رات وہاں رہ کر دوسرے دن صبح ہی کو لوٹ آؤں گا"۔

"اچھا کل بات کرنا، میں سوچتا ہوں کہ ٹیوب ویل پر تمہاری جگہ کس کی لگائی جائے! اور سنو بشیرے! تم صبح جا کر شام کو لوٹ آؤ گے، رات کو رکنے کی ضرورت نہیں"۔ ابو نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی، میں نہیں رکوں گا"۔ بشیرے جلدی سے بول اٹھا۔

پھر تیسرے دن یہ طے ہوا کہ آئندہ روز بشیرے کی جگہ ٹیوب و کون ڈیوٹی دے گا اب کنجاہ جانے کیلئے سائیکل کا مسئلہ تھا کیونکہ بشیر پاس سائیکل نہیں تھی۔ پیدل آنے جانے میں خاصی دیر لگ جاتی اور الگ ہوتی۔ یہ مسئلہ بھی ابو نے حل کرایا۔ ان کے ایک کارندے ک سائیکل تھی جو انہوں نے بشیرے کو دلا دی۔ طے یہ ہوا کہ آئندہ کارندے کے گھر سے سائیکل لے کر بشیرے ہمارے گھر آجائے گا او مجھ لیکر کنجاہ روانہ ہو جائیگا۔ شام تک ہم دونوں کو واپس آنا تھا کیونکہ دوسر صبح ہی صبح بشیرے کو ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔

صبح میں کیوں کہ ناہید کو پڑھانے بڑی حویلی جاتا تھا اس لئے ا زمینوں سے لوٹ کر وہاں یہ کہہ آیا، کل صبح نہیں آسکوں گا۔

اس رات مجھے بڑی مشکل سے نیند آئی۔ بار بار اپنے والد اور ا قاتل کا سفاک چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ پھر صبح ہی صبح میری آ گئی اور میں جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر تیار ہونے لگا امی مجھ سے جاگ چکی تھیں۔ بشیرے کے آنے سے پہلے میں ناشتا بھی کر چکا تھا۔ گزشتہ رات بھی مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کنجاہ کیوں جا رہا ہوں؟ اور ص سوال دہرایا، مگر میں اسے کیا جواب دیتا! اصل بات میں نے اسے بھی تھی حالانکہ کبھی میں اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ جمیلہ کو میری ا یقین نہیں آیا تھا کہ میں وہاں صرف تفریح کی غرض سے جا رہا ہوں شا وجہ یہ تھی کہ جھوٹی بات بہرحال جھوٹی ہوتی ہے اور اس میں اثر نہیں پہلا موقع تھا کہ میں نے جمیلہ سے جھوٹ بولا تھا، مگر یہ معاملہ ہی ایسا ہی کیا کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا جا سکتا تھا۔

بشیرے کے آتے ہی میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ابو ابھی گھر

نے بشیرے کو ایک بار پھر شام تک لوٹ آنے کی تاکید کی۔

سائیکل چلانا مجھے بھی آتا تھا اس لئے کنجاہ پہنچنے تک بشیرے کے انکار کے باوجود تقریباً آدھے راستے میں نے سائیکل چلائی۔ اپنے دشمن کی کے سلسلے میں پہلے میں نے بشیرے ہی کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن پہنچتے پہنچتے میرا ارادہ بدل گیا، میرے ذہن میں ایک اور بات آگئی تھی۔ کا تقاضا یہی تھا کہ میں، بشیرے کو بھی کچھ نہ بتاتا۔

بشیرے کا داماد کرمو کھیتوں پر کام کرنے گیا ہوا تھا۔ کرمو کے بوڑھے باپ بشیرے کی اور میری بڑی پذیرائی کی پھر اس نے کسی بچے کو کھیتوں کی طرف دیا کہ وہ کرمو کو بلا لائے۔

"میرا داماد بڑے ملک جی کا مزارع ہے"۔ بشیرے نے فخریہ انداز میں

"تمہاری مراد یہاں کے بڑی زمیندار ملک خوشی محمد سے ہے نا؟" میں نے ی سے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"ہاں جی، انہی سے! بشیرے جواباً بولا۔ یہ کہہ کر بشیرے اٹھ کھڑا ہوا۔ " ذرا اپنی نواسی کو دیکھ آؤں"۔

میں سوچنے لگا کہ قدرت خود بخود میری راہ ہموار کرتی جا رہی ہے۔ کرمو اپنے دشمن کا حلیہ بتا کر آسانی سے سب کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس ے بات کرنے کے بارے میں سوچا بھی تھا حالانکہ اس وقت میرے علم میں یہ ت نہیں تھی کہ کرمو، ملک خوشی محمد ہی کے کھیتوں پر کام کرتا ہوگا۔

کرمو کو کھیتوں سے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کا جوان تھا۔ اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ وہ آتے ہی گھر میں چلا گیا۔ میں اس کے بوڑھے باپ کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بشیرے اور کرمو گھر سے نکلے۔ کرمو کے ہاتھ میں

پانی سے بھرا ہوا لوٹا تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔ "ماپھ کرنا باؤ جی کہ ہاتھ دھلوانے میں دیر ہو گئی"۔

"نہیں، کوئی بات نہیں"۔ میں مسکرا کر کہنے لگا اور پھر منہ ہاتھ د کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کرمو سے میں نے منع بھی کیا کہ خود منہ دھو لوں گا مگر مانا۔ وہ پانی ڈالتا رہا اور میں منہ دھونے لگا۔ میں نے اسی دوران میں کرم مطلب کی بات کرلی۔ "میں تمہارے ساتھ گاؤں گھومنے چلوں گا کرمو!"

"جرول باؤ جی! میں چھٹی لیکر آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ع سے پھاطمہ کا پیو آیا ہے"۔ کرمو نے جواب دیا اور میں مطمئن ہو گیا۔

پھر لسی کا ایک دور چلا۔ مجھے ایک ایک پل بھاری لگ رہا تھا کہ کب میرے ساتھ چلے اور میں اس سے ضروری معلومات حاصل کر سکوں۔

"جا بھئی کرمو بیٹے، باؤ جی کو گاؤں کی سیر کرا لا۔ اور سن اپنے ملک باغ ضرور دکھانا ان کو!" بشیرے نے اپنے داماد سے کہا۔

کرمو فوراً میرے ساتھ چلنے کو راضی ہو گیا۔ کنجاہ، علی پور سے بھی گاؤں تھا۔ وہاں زیادہ تر مکانات کچے ہی تھے۔

"کرمو! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی، مگر یہ بات تمہار میرے ہی درمیان رہنی چاہئے۔ اپنے سسر کو بھی تم اس سلسلے میں کچھ نہی گے"۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"نہیں بتاواں گا جی، ہرگز نہیں بتاواں گا!" کرمو نے تیزی سے گ ہلائی۔

"آپ بولو کیا بات ہے!"

میں نے کرمو کو اپنے دشمن کا حلیہ بتایا، پھر بولا، "میں نے سنا ہے ک حلیے کا ایک آدمی، ملک خوشی محمد کا کارندہ ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟"

"نہیں جی، اس حلیے کا کوئی بندہ تو ملک جی کا کارندہ نہیں ہے،

لیے کے ایک آدمی کو میں نے ملک جی کے ڈلیور کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے۔ وہ کسی اور گاؤں کا ہے جی! یہاں سے چھ سات کوس پر ایک اور گاؤں ری ہے، وہ شاید وہیں کا ہے"۔ کرمو نے جواباً بتایا۔

"تمہیں نام تو معلوم ہو گا اس کا؟" میں نے نا امیدی کے زیر اثر بجھی ئی سی آواز میں پوچھا۔

"نا جی، ناں نہیں معلوم مجھے اس دا"۔

"تم مجھے ملک جی کے ڈرائیور سے ملوا سکتے ہو؟" مجھے ایک اور راہ نظر ئی۔

"وہ تو جی لاہور کے کسی ہسپتال میں زخمی پڑا ہے"۔

کرمو نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

میں چونک کر بولا۔

"پچھلے ہفتے ملک جی نے اسے کسی کام سے لاہور بھیجا تھا جی، وہ جبھی سے گاؤں نہیں لوٹا۔ سنا ہے اس کی جیپ کسی ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ بڑی وٹیں آئی ہیں جی اسے۔ مولا داد تو جی یہ کہہ رہا تھا کہ اس کا بچنا مشکل ہی لگتا ہے۔ داد اس کے چاچے کا بیٹا ہے"۔

پھر کرمو نہ جانے اور کیا کیا کہتا رہا مگر میں اس کی بات سن ہی کب رہا تھا! وہ شاید حادثے پر افسوس کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ملک خوشی محمد کے ڈرائیور سے ملنا بہت ضروری ہے، چاہے مجھے اس کے لئے لاہور ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اس کے ذریعے مجھے اپنے دشمن کا سراغ مل سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے کرمو سے ڈرائیور کا نام پوچھا۔ کرمو نے اس کا نام اللہ دتہ بتایا۔ ویسے تو مجھے یقین تھا کہ اللہ دتہ کو لاہور کے میو ہسپتال ہی میں ہونا چاہئے تھا، پھر بھی میں نے کرمو سے پوچھ لیا۔ "کرمو! تمہیں معلوم ہے، اللہ دتہ وہاں لاہور میں کس

ہسپتال میں ہے؟"

"مجھے تو نہیں پتا باؤ جی پر مولا داد کو جرول معلوم ہو گا۔ آپ کہو تو میں اس سے پوچھ لوں گا۔ وہ لاہور گیا بھی تھا۔ اللہ دتے کو دیکھنے!"

"ہمیں شام تک واپس علی پور جانا ہے اس لئے تم مولا داد سے ابھی کیوں نہ پوچھ لو!" میں نے کہا۔

"مولا داد کو چھوڑ دیں باؤ جی! میں ابھی اللہ دتے کے گھر سے پتہ کئے لیتا ہوں۔ اس کا پیو گھر ہی پر ہو گا۔ آئیں جی!"

پھر میرا خیال درست ہی ثابت ہوا۔ اللہ دتے کے ساتھ حادثے کے وقت اس کا کوئی دوست بھی تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہسپتال میں داخل تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں اللہ دتہ کے ساتھ میرا دشمن ہی نہ ہو۔ اگر واقعی میرا خیال درست تھا تو اللہ دتہ کا چچا زاد' مولا داد اس کی تصدیق کر سکتا تھا اس خیال نے میرے جسم میں برقی رو سی دوڑا دی۔ کرمو سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مولا داد اس وقت کھیتوں پر ہو گا۔ پھر میرے ایماء پر کرمو مجھے کھیتوں کی طرف لے گیا۔ میں نے یہ بھی سوچا' ممکن ہے مولا داد بھی میرے دشمن کو جانتا ہو۔

مولا داد نے جو کچھ بتایا اس سن کر میرے جذبات میں ہیجان سا پیدا ہو گیا میرا قیاس قطعی درست ثابت ہوا تھا۔ اللہ دتہ کے ساتھ زخمی ہونے والا میرا دشمن ہی تھا۔ مولا داد نے اس کا حلیہ سن کر اس کی تصدیق کر دی تھی' لیکن میرے دشمن کے بارے میں اس کے نام سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا اور یہ بھی اسے ہسپتال ہی میں معلوم ہوا تھا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا اکبر!"

کھیتوں سے لوٹتے ہوئے میں بڑبڑایا۔ پہلی بار مجھے اپنے دشمن کے نام کا علم ہوا تھا۔

کرمو سمجھا میں نے اس سے کچھ کہا ہے' مگر میں اسے ٹال گیا' میں تو اب ی کی چوتھائی میں لاہور پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے اب کنجاہ میں ایک ایک لمحہ ارنا محال ہو رہا تھا۔



خدا خدا کر کے شام ہوئی اور میں، بشیرے کے ساتھ علی پور ک
روانہ ہوا۔ مجھے جتنی جلدی تھی بشیرے بدبخت نے اتنی ہی دیر کر دی
دونوں کو شام تک علی پور واپس پہنچنا تھا۔ مگر وہ شام کو وہاں سے چلا تھا۔
بیٹی نے کھانا کھا کر جانے پر ضد کی تھی۔ اور کھانے کے انتظار میں بشیر
کچھ دیر رک گیا تھا۔ نتیجتاً ہم اس وقت علی پور پہنچے جب گاؤں
میں عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ توقع کے مطابق ابو اور امی دونوں ہی
تھے۔ ابو نے اس پر بشیرے کو ڈانٹ بھی پلائی اور وہ دانت نکال کر رہ گ
نے زبان سے تو اپنی فکر مندی کا اظہار نہیں کیا۔ مگر اس کا چہرہ جذبات
کر رہا تھا۔ یقیناً اسے بھی میرے تاخیر سے لوٹنے پر فکر تھی۔ اسی رات
ابو سے لاہور جانے کو کہہ دیا۔

"مگر تم لاہور کیوں جانا چاہتے ہو فیروز بیٹے؟" ابو نے پوچھا۔

یہ سوال میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لئے میں نے فوراً

ابو! لاہور بہت یاد آ رہا ہے۔"

"کمال ہے بھئی! ابھی ہمیں وہاں سے آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں! کیا یہاں تمہارا جی نہیں لگ رہا؟ آج ہی تو تم کنجاہ گھوم کر آئے ہو اور اب لاہور جانے کو کہہ رہے ہو!"

"ہو آنے دیں۔" امی میری حمایت میں بولیں۔

"یہ عمر ہی گھومنے پھرنے کی ہوتی ہے۔ کالے سر والی پلے بندھ گئی تو پھر سب گھومنا پھرنا بھلا دے گی۔"

"مگر یہ بھی تو سوچو نا کہ ملک صاحب کیا کہیں گے۔! دو دن پڑھا کر چھٹیاں شروع کر دیں!" ابو نے کہا۔

"ان سے میں کل ہی صبح اجازت لے لوں گا ابو! ان کی فکر نہ کریں۔" میں جلدی سے بولا۔

"تم جانو بھئی ویسے جانا کب ہے؟"

"کل ہی چلا جاؤں گا، ناہید کو پڑھا کر اور انشا اللہ پرسوں دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔ پرسوں میں ناہید کو شام کے وقت پڑھانے چلا جاؤں گا۔ تاکہ ناغہ نہ ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"اور وہاں ٹھہرو گے کہاں تم؟" ابو نے دریافت کیا۔

"وہاں کئی دوست ہیں میرے، کہیں بھی کسی کے بھی یہاں ٹھہر جاؤں گا۔ ایک رات ہی کی تو بات ہے ابو!"

ابو کو تو خیر میں نے کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا۔ مگر جمیلہ میرے لئے ضرور ایک مسئلہ تھی۔ ایک بار پھر مجھے وہی مرحلہ درپیش تھا، جھوٹ بولنے کا مرحلہ! دوسرے ہی دن صبح اس نے میری خبر لے لی۔ "فیروز! تمہیں آخر ہو کیا گیا ہے! ایسی کیا بات ہے جو تم مجھ سے بھی چھپا رہے ہو، بولو!"

"ایسی کوئی بات نہیں جمیلہ! میں زچ سا ہو کر بولا۔

"میں نے آج تک کوئی بات چھپائی مگر اب ضرور چھپانے لگے ہو! ٹھیک ہے نہ بتاؤ میں بھی اب تم سے نہیں بولوں گی۔"

اس نے منہ پھلا لیا۔

پھر بڑی مشکل سے میں نے اسے رام کیا اور اس چکر میں مجھے بڑی حو جانے کو دیر ہو گئی۔ ناہید میری منتظر بیٹھی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"کل آپ نہیں آئے تو بڑا عجیب سا لگا۔ بالکل یہی محسوس ہوا مجھے جی دن ہی نہ نکلا ہو۔"

ناہید نے کچھ ایسے بھولپن سے اپنے جذبات کا اظہار کیا کہ میں اس صورت دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگی۔

"کل بھی میں نہیں آسکوں گا' لاہور جانا ہے۔" میں نے بتایا

"کہو تو ملک جی سے اجازت لے لوں!"

"آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں' مگر..... لاہور کیوں جا رہے ہیں اور ..... واپسی کب ہو گی؟" ناہید کا چہرہ اتر گیا۔

"کل ہی واپس آ جاؤں گا۔ تم بے فکر رہو' تمہاری پڑھائی کا حرج ن ہو گا۔ میں تمہیں شام کو آکر پڑھا جاؤں گا۔"

میں نے دانستہ اب اسے کبھی کبھار "تم" سے مخاطب کرنا شروع ک تھا۔

"پڑھائی کی تو مجھے کوئی ایسی زیادہ فکر نہیں ہے لیکن ......" وہ کچھ کہتے رک سی گئی' پھر بولی۔

"اگر کل شام کو آئیں گے تو..... تو پھر میں انتظار کر لوں گی۔"

اس روز پہلی بار مجھے خطرے کی گھنٹی بجتی محسوس ہوئی۔ کہیں ناہید پسند تو نہیں کرنے لگی؟ میں نے سوچا پڑھائی کی فکر نہ ہونے کے باوجود انتظار کا اور کیا مطلب ہو سکتا تھا! پھر میرے آتے ہی اس نے جو بات کہی

بھی اسی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ ایک معصوم سی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ ں اسے دھوکے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کوئی مناسب قع دیکھ کر اسے بتا دوں گا کہ میرے دل پر پہلے ہی سے کسی اور کا قبضہ ہے۔

ناہید کے ایما پر میں نے کل صبح کے بجائے شام کو آنے کے متعلق ملک رفراز سے کچھ نہ کہا اور وہاں سے لوٹ آیا۔ گھر پہنچا تو شہناز میری منتظر تھی۔ ں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "میں دیکھ رہی تھی کہ تم کب تک نہیں آتے مگر تم واقعی بڑے کٹھور نکلے۔ میں نے سوچا' چلو میں ہی چھوٹی بن جاتی ہوں۔ میں نہیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔ بھا افضل سے بھی میں نے وعدہ لے لیا ہے' اب وہ تمہیں نہیں چھیڑیں گے۔"

"مگر میں تو آج ہی لاہور جا رہا ہوں"۔ میں نے اسے بتایا۔

"تو پھر چلو میں بھی چلتی ہوں۔ تمہارے ساتھ! بہت دن ہو گئے مجھے بھی لاہور گئے۔" وہ میرے ساتھ لاہور چلنے پر بھی راضی ہو گئی۔

"میرا ساتھ ہو گا تو تمہیں وہاں رہنے سہنے کی بھی پریشانی نہیں ہو گی۔ ہماری ایک کوٹھی وہاں بھی ہے' گلبرگ میں!" شہناز کہنے لگی۔

"لیکن میں وہاں تفریح کے لئے نہیں جا رہا ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں اور کل ہی لوٹ آؤں گا"۔ میں بولا۔

"تو کیا ہوا! میں بھی تمہارے ساتھ کل ہی لوٹ آؤں گی یہاں سے اپنی جیپ میں چلیں گے' بس تین ہی گھنٹے کا تو سفر ہے۔ یوں بھی بہت دن سے میرا جی لانگ ڈرائیو کو چاہ رہا ہے' تم اپنا کام کر کے کوٹھی لوٹ آنا' اتنے میں شاپنگ کر لوں گی۔ پھر ہم دونوں رات کا کھانا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھائیں گے۔ پلیز فیروز! مان جاؤ نا!"

شہناز نے اتنا اصرار کیا کہ میں انکار نہ کر سکا اور جلدی کپڑے بدل کر تیار ہو گیا۔ رات کو پہن کر سونے اور کل بدلنے کے لیے دو جوڑے نیز دیگر

ضروری سامان میں نے ایک ایئر بیگ میں پہلے ہی رکھ لیا تھا۔ میں جانے کے لیے تیار ہو گیا تو جمیلہ نے مجھے اشارہ کیا میں اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ تو وہ ایک دم مجھ پر برس پڑی۔

"اس حرافہ کے ساتھ تمہارا لاہور جانا مجھے قطعی پسند نہیں۔ منع کر دو اسے کہ تم لاہور نہیں جا رہے ہو!" جمیلہ نے فیصلہ سنا دیا۔

"اب تو میں اس کے ساتھ جانے پر آمادگی ظاہر کر چکا ہوں' منع کس طرح کر دوں۔ تم مطمئن رہو' میں اس کے ساتھ ہرگز گھوموں پھروں گا نہیں!" میں نے جمیلہ کو سمجھایا۔

"رات کو تو رہو گے نا اس کے ساتھ کوٹھی میں!" جمیلہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"خدا غارت کرے اسے! معلوم نہیں عین وقت پر کہاں سے آٹپکی! بہر حال تمہیں میں اس کے ساتھ نہیں جانے دوں گی!"

"حد کرتی ہو تم بھی! ارے میں بھی کوئی لڑکی ہوں جو ....." میں روا روی میں ایک نازیبا بات کہتے کہتے رک گیا۔

"سنو! میں اکیلا گھوموں گا! اور اگر تم بھی چاہتی ہو کہ رات کو اس کی کوٹھی میں نہ سوؤں تو یہ بھی ہو جائے گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ میرے کچھ دوست بہ ضد ہیں کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ پھر صبح میں اس کی کوٹھی پہنچ جاؤں گا۔"

"سچ کہہ رہے ہو تم! ادھر میری طرف دیکھ کر وعدہ کرو کہ اس کی کوٹھی میں رات نہیں گزارو گے!" جمیلہ نے یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

اسی وقت باہر سے شہناز کی آواز سنائی دیں۔

"اب چلو بھی نا فیروز! ابھی گھر چل کر مجھے بھی تیار ہونا چاہیے بھئی!"

"بڑی ہی کتی عورت ہے یہ بھی!" جمیلہ غصے میں بڑبڑائی۔

میں نے چلتے چلتے اس سے وعدہ کر لیا کہ لاہور میں شہناز کی کوٹھی کی ۓ اپنے کسی دوست کے گھر سو جاؤں گا۔ پھر میں ایئر بیگ اٹھا کر کمرے سے گیا۔ امی صبح ہی مجھے خرچے کے لئے خاصی رقم دے چکی تھیں۔ شہناز وہاں مجھے اپنے گھر لے گئی چودھری افضل گھر پر ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سی بھر گئی۔ مجھ سے تو وہ کچھ نہیں بولا' ہاں اپنی بہن ضرور چھیڑا۔ "مبارکاں! آخر کتنے میں گل کی؟ ..... پر تم نے تو بی اے کر ہے' کیا دوبارہ امتحان میں بیٹھنے کا ارادہ ہے ٹیوشن پڑھ کر؟"

میں چودھری افضل سے کوئی بات کہنے ہی والا تھا کہ شہناز درمیان میں اٹھی۔

"دیکھو افضل! اب کوئی گڑبڑ نہیں چلے گی۔ فیروز سے میری دوستی ہو گئی میں آج ہی بلکہ اسی وقت اس کے ساتھ لاہور جا رہی ہوں۔"

اس کے لہجے میں خود سری تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی خاطب ہے۔

"ڈرائیور کو بھی ساتھ لے لینا!" چودھری افضل نے کہا۔

"نہیں بھئی! میں خود ہی جیپ ڈرائیو کروں گی۔" شہناز نے اپنے بھائی شورے کو رد کر دیا۔

"تم جانو! میں تو خراب راستے کی وجہ سے کہہ رہا تھا۔" چودھری افضل لہا۔

"آؤ ڈیئر فیروز! شہناز نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

پھر وہ مجھے اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔ اس نے تیار ہونے میں زیادہ دیر لگائی تھی۔ میں اس دوران میں مسہری کے قریب بچھی ہوئی ایک کرسی پر اس رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا تھا۔ جو شہناز نے مجھے تھما دیا تھا اور

خود باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ رسالہ انگریزی تھا۔

جب وہ باتھ روم سے نکل کر آئی تو اسے پینٹ پہنے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ "تم تو کہہ رہی تھیں کہ گاؤں میں اس لباس کو پہن کر....."

"ارے یار' بس یوں زن سے گزر جائیں گے' کون دیکھے گا چلتی دھول اڑاتی جیپ میں کہ میں نے کیا پہن رکھا ہے!" وہ میری بات کاٹ تکلفی سے بولی۔

باتھ روم جانے سے پہلے اس نے ایک ائر بیگ میں اپنے کپڑے او ضروری اشیاء رکھ لی تھیں۔ اس کے گیسو شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اب ایک شانے پر اس نے ایئر بیگ لٹکا لیا تھا۔ اپنے حلیے اور رنگ میں وہ کوئی غیر ملکی ٹورسٹ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ خود تو خوب صورت کا ذہن خوب صورت نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اس کے ساتھ جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھا ہوا دہشت کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ کسی طوفانی بگولے کی طرح جیپ چلاتی ہوئی میں گاؤں کو پیچھے چھوڑ کر پختہ سڑک تک پہنچ گئی تھی ذرا دیر کو تو میں رہا' پھر مجبوراً مجھے بولنا ہی پڑا۔

"شہناز! یہ کیا کر رہی ہو تم؟ اتنی تیز ڈرائیونگ نہ کرو!"

"کیوں' کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کو تم اتنی ریش ڈرائیونگ کرتی ہو تو میں تمہارے ساتھ سفر کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔"

"مجھے سینسیشن میں مزہ آتا ہے' لیکن تم کہتے ہو تو صرف خاطر جیپ کو گدھا گاڑی بنانے پر راضی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے رفتار کچھ کم کر دی۔

"شکریہ!" میں مسکرا کر بولا۔

"مجھے تو ابھی کچھ دیر پہلے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جمبوجٹ میں سفر کر رہا ہوں۔"

"رہنے بھی دو یار! بس دیکھ لیا تمہیں۔ تمہارے سینے میں کسی چڑیا کا دل ہے۔" وہ زور سے ہنس کر بولی۔

"میں تمہارے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت' فاختہ اڑی ہوئی تھی تمہاری!"

"جسم کے چیتھڑے اڑنے سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ آدمی کی فاختہ اڑ جائے۔" میں بھی یہ کہہ کر ہنسنے لگا' پھر اس سے پوچھا۔

"لاہور والی کوٹھی کیا خالی پڑی رہتی ہے؟"

"نہیں! شہناز نے بتایا۔

"وہاں دو ایک نوکر اور ہماری فرم کا مینجر رہتا ہے۔"

"فرم؟...... کس چیز کی فرم ہے؟" میں حیرت سے بولا۔

"امپورٹ ایکسپورٹ کا چھوٹا سا کاروبار ہے۔ اس کاروبار کو ہمارا مینجر لک آفٹر کرتا ہے۔ جو ہمارا عزیز بھی ہے۔ افضل کو اس پر بھروسا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ تھوڑا بہت روڑا ضرور لگاتا ہو گا۔ آخر بڈھا گھاگ آدمی ہے۔ میں نے افضل سے یہ کہا بھی تھا۔ مگر وہ بولا کہ اگر تھوڑا بہت کھا پی بھی لیتا ہے تو کوئی حرج نہیں' محنت بھی تو کرتا ہے۔ ہم تو بس دو ایک مہینے میں کبھی کبھار ہی چیکوں اور ضروری کاغذات پر دستخط کرنے جاتے ہیں۔ تمہیں خبر ہے کہ لاہور والی کوٹھی اور یہ فرم کس کے نام ہے؟"

"ظاہر ہے مجھے کیسے خبر ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"کوٹھی اور فرم میرے نام ہے۔"

اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے مجھے اپنی امارت سے مرعوب کرنا چاہتی ہو پھر اس نے مزید کہا۔

"اس کے علاوہ گاؤں کی زمینوں میں بھی میرا حصہ ہے۔"

"پھر تم تو بڑی امیر کبیر خاتون ہوئیں!"

میرے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی مگر شاید اس نے یہ چبھن محسوس نہیں کی۔

"مگر کیا فائدہ ایسے امیر کبیر ہونے کا! ہماری پروا کون کرتا ہے۔ لوگ تو ہم سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔" وہ بڑی حسرت سے بولی۔

اس کا اشارہ واضح طور پر میری طرف تھا' لیکن میں خاموش رہا۔ اب اس میں کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کہ شہناز مجھے پسند کرنے لگی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے فیروز کہ میں زبردستی کیوں تمہارے ساتھ آئی ہوں؟"

وہ سوال کر کے چند لمحے خاموش رہی' پھر خود ہی کہنے لگی۔

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی' اکیلے میں!"

وہ اکیلے میں مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔ یہ سن کر میں چونک اٹھا' مگر خاموشی ہی کو غنیمت جانا۔

"تم پوچھو گے نہیں کہ وہ کیا ضروری بات ہے؟" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

ہاں..... ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟" بالآخر مجھے بولنا ہی پڑا۔

"میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا بایاں ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن ..... لیکن میں ..... میں تو کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔ شہناز ..... یہ ممکن نہیں!"

میں نے رک رک کر اپنی بات کہہ ہی دی تاکہ وہ میرا خیال اپنے دل سے نکال دے۔

"تو کیا میں اس کا مطلب یہ سمجھوں کہ تمہیں میری محبت قبول نہیں؟"
ں کا لہجہ بدلنے لگا۔

"میں نے وجہ بتا دی نا!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میری محبت ٹھکرا کر تم نے توہین کی ہے میری! اور..... اور فیروز..... ں اپنی توہین کسی صورت برداشت نہیں کرتی!" اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ " مجھے نہیں جانتے فیروز' ورنہ میری محبت کو ٹھکرانے کی ہمت نہ کرتے! میری ت یاد رکھنا کہ جو چیز مجھے سیدھی طرح نہیں ملتی' میں اسے چھین لیتی ہوں!"

میں نے یہ سوچ کر کہ شاید وہ میری محبت کے آڑے نہ آئے' اسے جمیلہ ے بارے میں بتا دیا اور مزید کہا۔

"وہ میری بچپن کی محبت ہے' میں اس سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر تا!"

"اور میں یہ تصور نہیں کر سکتی فیروز کہ تم میری بجائے کسی اور کے ہو ؤ! میں کسی قیمت پر ایسا نہیں ہونے دوں گی! میری محبت کو نفرت میں بدلنے کی شش مت کرو فیروز! اگر ایسا ہو گیا تو تمہیں بہت پچھتانا پڑے گا۔ اب بھی ج لو فیروز' وقت ہے" اس کی آواز میں دھمکی تھی۔ "میں تمہیں کل تک چنے کی مہلت دیتی ہوں۔ لاہور سے واپسی میں تمہیں اپنا فیصلہ سنانا پڑے گا میری محبت چاہیئے یا نفرت! فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا فیروز! کہیں ایسا نہ ہو تم ے فیصلے کی وجہ سے ساری زندگی پچھتاتے رہو۔"

میں سوچنے لگا کہ خواہ مخواہ اس کے ساتھ آیا مگر پھر یہ بات ذہن میں آئی نہ آتا تو بھی وہ کوئی نہ کوئی موقع نکال ہی لیتی۔ اس گفتگو کے بعد سارے تے اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ جیپ جب لاہور شہر کی حدود میں ل ہوئی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "مجھے اپنی کوٹھی کا نمبر وغیرہ بتا دو' میں اری کام سے فارغ ہو کر وہاں آ جاؤں گا۔"

"تمہیں جانا کہاں ہے؟" اس نے سپاٹ سی آواز میں معلوم کیا۔

"میو ہسپتال۔" میں نے بتایا۔

"وہاں مجھے ایک شخص کی عیادت کرنا ہے۔"

"اگر تمہیں وہاں زیادہ دیر نہ لگے تو میں باہر جیپ میں تمہارا انتظار کر سک ہوں۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگی۔

"کچھ خبر نہیں، کتنی دیر لگ جائے مجھے وہاں۔" میں بولا۔

"بہتر یہ ہے کہ تم چلی جاؤ۔"

"اچھا میں تمہیں میو ہسپتال چھوڑ دیتی ہوں، تم کوٹھی آ جانا!" اس کوٹھی کا نمبر بتا کر مجھے پتا سمجھایا۔

"ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گا۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔

شہناز نے جیپ کو میو ہسپتال کی طرف موڑ دیا پھر کچھ ہی دیر بعد وہاں چھوڑ کر چلی گئی۔ شہناز کی باتوں سے ہر چند کہ میرا ذہن الجھن کا شکا گیا تھا لیکن میو ہسپتال پہنچتے ہی جیسے وہ ساری باتیں بھول گیا۔ اب میرے میں صرف اپنے دشمن کا خیال تھا۔ کنجاہ میں مولاداد سے مجھے ملک خوشی محم ڈرائیور اللہ دتہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس وارڈ میں اور اس کا بیڈ نمبر کیا ہے! مولاداد نے میرے دشمن کے متعلق بتایا تھا کہ و اللہ دتہ کے برابر والے بیڈ پر ہے۔

دھڑکتے دل کے ساتھ میں مطلوبہ وارڈ میں پہنچا اور پھر اس بیڈ نمب پہنچا جس پر اللہ دتہ کو ہونا چاہئے تھا، مگر بیڈ خالی تھا۔ اس کے بعد والے اپنے دشمن اکبر کی بجائے مجھے ایک ادھیڑ عمر عورت لیٹی ہوئی نظر آئی میں سوچا کہ کہیں میں کسی اور وارڈ میں تو نہیں آ گیا! اس وقت سامنے سے نرس آتی دکھائی دی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"سسٹر!" میں نے نرس کو مخاطب کیا۔

"یہاں اس بیڈ پر حادثے کا ایک مریض اللہ دتہ اور برابر والے بیڈ پر اس کا دوست اکبر تھا، وہ دونوں....."

"تم ان دونوں سے ملنے آئے تھے یا کسی ایک سے؟" نرس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا وہ تمہارا عزیز تھا؟"

نرس نے میری بات کا جواب دینے سے پہلے مزید پوچھا جو میرے لئے خلاف توقع بات تھی۔

"عزیز تو نہیں، ہاں وہ دوست تھا میرا۔" میں نے نرس کو بتایا۔

"ویری سوری مسٹر! اللہ دتہ گزشتہ رات انتقال کر گیا۔ آج ہی صبح اس کے عزیز اس کی لاش یہاں سے لے گئے ہیں۔" یہ کہہ کر نرس آگے بڑھنے لگی۔ اب میں سمجھا کہ وہ مجھ سے کیوں اتنی پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی قدم اٹھانے لگا۔

"اور سسٹر، وہ..... وہ دوسرا مریض اکبر!..... کیا وہ بھی...."

نرس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو! وہ زندہ ہے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی جس پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا ہے۔ اسے تو کل صبح ہی چھٹی مل گئی تھی۔"

نرس کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ منزل میرے قریب آ کر دور ہو گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کاش اللہ دتہ ہی زندہ بچ جاتا! میں اس سے اپنے دشمن کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا میری لاہور آمد قطعی بے سود ثابت ہوئی تھی۔ میں ایک بار پھر تاریکی میں تھا۔ بوجھل قدموں کے ساتھ ہسپتال کے گیٹ سے نکلتے ہوئے مجھے کرمو کی بات یاد آئی اس نے کہا تھا کہ ممکن ہے، جس شخص کی مجھے تلاش ہے وہ ایک اور قریبی گاؤں ڈبگری کا رہنے والا ہو۔ میں انہیں خطوط پر سوچنے لگا۔ سوچتے ہوئے میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ میرا دشمن یقیناً" کسی آس پاس

کے گاؤں میں ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے دشمن کی تلاش میں آس پاس کے سارے گاؤں چھان ماروں گا وہ مجھے کہیں نہ کہیں تو مل ہی جائے گا۔ اس فیصلے سے میرے دل کو قدرے سکون ہوا۔ ہسپتال سے نکل کر میں یوں ہی پیدل ایک طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اب میرے ذہن میں ایک اور سوال تھا کہ کل تک لاہو میں رہوں یا نہ رہوں؟ اب یہاں مزید رکنا لاحاصل ہی تھا پھر مجھے یہی بہتر معلو ہوا کہ آج ہی علی پور واپس چلا جاؤں۔ ابھی وقت تھا اور میں شام ہوتے ہو علی پور پہنچ سکتا تھا۔ اس خیال کا ایک سبب جمیلہ بھی تھی۔ وہ مطمئن ہو جاتی میں، شہناز کے ساتھ اس کی کوٹھی میں رات کو نہیں رہا۔

اخلاقاً مجھے شہناز کو اپنی واپسی سے مطلع کرنا چاہئے تھا اس لئے میں۔ گلبرگ کے لئے ایک رکشہ کر لیا۔ وہاں پہنچ کر مطلوبہ کوٹھی تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

رکشہ کا کرایہ ادا کر کے میں کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچا گیٹ کھلا اور ایک جیپ باہر نکلی میں اچھل کر ایک طرف نہ ہو جاتا تو یقیناً ج کے نیچے آ گیا ہوتا۔ میری نظر جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف اٹھی تو شہنا دیکھا وہ اس وقت سرخ ساری پہنے ہوئے تھی۔ چند قدم آگے جا کر جیپ ر گئی اور پھر ریورس میں میری طرف بڑھ گئی۔ شہناز نے یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا

"تم بہت جلدی واپس آ گئے!" جیپ رکتے ہی شہناز مجھ سے مخاط ہوئی۔

"آؤ بیٹھ جاؤ! میں شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں۔"

"نہیں، میں دراصل تم سے یہ کہنے آیا تھا کہ مجھے یہاں جو کام تھا، و گیا۔ اب میں واپس علی پور جا رہا ہوں۔"

"تم بیٹھو تو سہی جیپ میں!" اس کی آواز میں جھنجلاہٹ آ گئی۔

"بس میں ہی دھکے کھانے کا شوق ہے تو میں تمہیں بس اسٹینڈ پر چھوڑ د

گی۔"

مجبوراً مجھے جیپ میں سوار ہونا پڑا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے جیپ آگے بڑھا دی۔ اس نے کوئی عمدہ قسم کی غیر ملکی خوشبو لگا رکھی تھی۔ جو مجھے مسحور کیے ہوئے تھی۔

"لاہور آ کر یہاں گھومے پھرے بغیر واپس جانا میرے نزدیک سراسر حماقت ہے۔ تم ایک نوجوان ہو، کیا تمہارے اندر کسی بوڑھے کی روح حلول کر گئی ہے۔! معلوم نہیں تم کس مٹی کے بنے ہو!"

"تم جو چاہے کہو اور جو چاہے سمجھو مگر میں آج ہی علی پور واپس جاؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اور میں تمہیں نہ جانے دوں تو؟"

وہ ایک ادا سے بولی سرخ ساری میں اس کا حسن واقعی غضب ڈھا رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور نوجوان ہوتا اس کے دام حسن میں ضرور آ جاتا۔

"عجیب زبردستی ہے!" میں زیر لب کہنے لگا۔

"تم مجھے کیوں نہیں جانے دو گی؟"

"بس میری مرضی!..... اور میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ پھر تمہیں کل میری بات کا جواب بھی تو دینا ہے۔ میں نے تمہیں کل ہی تک کی تو مہلت دی ہے نا!"

"اگر میں آج اور اسی وقت جواب دے دوں تو مجھے علی پور جانے دو گی؟"

"زندگی بھر کا فیصلہ اتنی عجلت میں نہیں کیا جاتا، سمجھے تم! اگر ایسا کرو گے تو اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں ہو گی۔ بہتر یہی ہے کہ مہلت سے فائدہ اٹھاؤ۔" اس نے مجھے نصیحت کی۔

پھر اس نے جو کہا تھا، وہی کر دکھایا۔ مجھے اس نے علی پور واپس نہیں

جانے دیا تھا۔ پہلے اس نے شاپنگ میں خاصی دیر لگا دی' اس کے بعد وہ مجھے ساتھ لئے ایک پکچرہاؤس میں گھس گئی وہاں ایک انگریزی فلم لگی ہوئی تھی جو صرف بالغوں کے لیے تھی۔

"کوئی اور فلم بھی تو دیکھی جا سکتی تھی"۔ میں نے فلم کے نیم عریاں اسٹلز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہاں مجھے شہناز کے سوا کوئی عورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کیوں' کیا تم بچے ہو؟"

وہ ٹکٹ ونڈو کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگی۔

آس پاس اور لوگ بھی موجود تھے۔ میں ان کی موجودگی میں تماشا بننا نہیں چاہتا تا اس لئے خاموش ہو گیا۔ جب شہناز ٹکٹ لے رہی تھی تو میں ٹکٹ ونڈو کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے۔ شاید اس حیرت کا سبب یہ تھا کہ پورے پکچرہال میں اس فلم کی ٹکٹ لینے وا واحد عورت شہناز ہی تھی۔ فلم کے پوسٹرز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ فل بطور خاص میڈیکل کے طلبہ کے لیے بنائی گئی تھی۔

اس کا موضوع "تخلیق آدم" تھا۔ شہناز نے باکس کا ٹکٹ لیا تھا۔ میں بہ حال بہ مجبوری اس کے ساتھ باکس میں جا بیٹھا جہاں میرے اور اس کے س تیسرا کوئی فرد نہیں تھا۔ فلم میں کئی ایسے مناظر آئے کہ میں نے نظریں نیچی لیں مگر شہناز پوری دلچسپی سے فلم دیکھتی رہی۔

"میرے نزدیک اس فلم میں انجوائے کرنے کو کچھ نہیں ہے مجھے تو گھن رہی ہے۔" بالا آخر میں نے اکتا کر کہا۔

"تم بور کر رہے ہو مجھے! ..... اگر واقعی تمہیں گھن آ رہی ہے' زند کے حقائق سے تو یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو ادھوری چھوڑ کر اٹھ جاؤں گی۔"

"اور یہ بہت مناسب ہو گا۔" میں نے فوراً کہا۔

"تم کسی پتھر سے کم نہیں ہو' چلو اٹھو!" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ میں بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہو گیا۔

پکچرہاؤس کے قریب ہی ایک اچھا ہوٹل تھا۔ شہناز نے وہاں جیپ روک دی۔ اس ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران میں مجھے جمیلہ سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ میں' شہناز کی کوٹھی میں رات نہیں گزاروں گا۔ یہی سوچ کر میں نے اس سے کہا۔

"شہناز مجھے مغل پورے چھوڑ دینا!"

"وہ کس خوشی میں؟"

اس نے تیوریاں پر بل ڈال کر دریافت کیا۔

میں اس دوران میں بہانہ سوچ چکا تھا' سو فوراً بولا۔ "میں نے گاؤں جاتے ہوئے اپنے ایک دوست سے وعدہ کیا تھا کہ اب لاہور آیا تو تمہارے ہی گھر ٹھہروں گا۔ رات اس کے گھر گزار لوں گا تو وہ خوش ہو جائے گا اور میرا وعدہ بھی وفا ہو جائے گا۔"

"کیوں' کیا میں تمہاری دشمن ہوں' دوست نہیں؟ اور کیا تمہارے نزدیک میری خوشی کی کوئی اہمیت نہیں؟" وہ قدرے طنزیہ لہجے میں بولی۔ پھر اس نے خود ہی فیصلہ سنا دیا۔

"سنو! میں نے تمہیں تمہارے کسی دوست کی خوشی کے لیے نہیں روکا تم کہیں نہیں جاؤ گے!"

"اور اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کروں؟" مجھے اس کی زبردستی پر غصہ آنے لگا۔

"تو اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔ تم یہ رات پھر اپنے دوست کے ساتھ نہیں بلکہ حوالات میں گزارو گے!"

"تم دھمکی دے رہی ہو مجھے؟"

"اگر تم اسے صرف دھمکی سمجھ رہے ہو تو میری بات سے انکار کر کے دیکھ لو۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ....."

"دیکھو شہناز' بات نہ بڑھاؤ تو اچھا ہے"۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا' مگر سمجھنے والی "شے" نہیں تھی۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہی' بہرحال کھانا کھا کر جب ہم ہوٹل سے نکلے تو میں نے اسے کہا۔

"اچھا خدا حافظ شہناز! میں صبح تمہاری کوٹھی آ جاؤں گا۔"

میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا اور جنونی انداز میں بولی۔

"اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں کپڑے پھاڑ کر شور مچانا شروع کر دوں گی کہ تم نے مجھ پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔"

"ایک طرف تمہیں مجھ سے محبت کا دعویٰ ہے' دوسری طرف تم مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی دھمکی دے رہی ہو! میں اس تضاد کو نہیں سمجھ سکا' میری آواز میں شکست خوردگی تھی۔

"میرے نزدیک یہ بھی محبت ہی کا ایک رخ ہے۔ چلو بیٹھو جیپ میں!" شہناز کے لہجے میں حکم تھا۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مجھے اس کے حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑی۔

"ویسے تم مجھ پر جبر کر کے اچھا نہیں کر رہیں۔" میں بولا۔

اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ مجھے اپنے اچھے برے کی فکر نہیں۔"

کوٹھی پہنچ کر مجھے وہاں صرف ایک ملازم نظر آیا۔ اسی نے کوٹھی کا پھاٹک بھی کھولا تھا۔ شہناز نے گیٹ کھولنے کے بعد ہی اس سے کہہ دیا تھا۔ "اب بھی اپنے کوارٹر میں جاؤ!"

وہ ملازم گیٹ اندر سے بند کر کے بائیں جانب چلا گیا تھا۔ شہناز مجھے اپنے ساتھ لئے عمارت کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ عمارت کے اندر سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی اور نہ ہو۔

"تم تو مجھے بتا رہی تھی کہ یہاں تمہاری فرم کا مینجر رہتا ہے!" میں نے شہناز کو مخاطب کیا۔

"میں نے یہاں پہنچتے ہی کہہ دیا تھا کہ کل تک کے لیے کہیں اور رہنے کا بندوبست کر لے۔ دفتر میں اسے میں نے فون کر دیا تھا وہ اسی لئے دفتر سے لوٹ کر یہاں نہیں آیا' اکیلا آدمی ہے وہ' کہیں بھی ایک رات گزار لے گا۔ اس کے اس شہر میں کئی قریبی عزیز موجود ہیں۔ دراصل میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ ہماری خلوت میں کوئی مخل ہو۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

وہ کوٹھی خاصی بڑی تھی اور میرے سونے کے لیے کسی دوسرے کمرے کا بندوبست بھی ممکن تھا مگر شہناز نے ایسا نہیں کیا۔ اسی کمرے میں مجھے بھی سونا پڑا جہاں شہناز کا بیڈ تھا۔ سونے سے قبل اس نے مجھے ایک اور حیرت میں مبتلا کیا۔ اس نے سگریٹ نوشی شروع کر دی اور مجھے بھی پیش کش کی جو میں نے سختی کے ساتھ مسترد کر دی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ نشے کی آڑ میں مجھ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس کی بانہیں جھٹک دیں اور پھر اپنے بیڈ پر آ کے لیٹ گیا۔

"تم ..... تم مجھے ٹھکرا کر میری بے عزتی کر رہے ہو! تم نے میری ..... میری توہین کی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی' پھر پوری قوت سے چیخ اٹھی۔ "نکل جاؤ میری کوٹھی سے! اسی وقت دفع ہو جاؤ!"

میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں تیزی کے ساتھ مسہری سے اٹھا اور سرہانے رکھا ہوا اپنا ایئر بیگ اٹھا لیا۔

"ٹھیک ہے! میں جا رہا ہوں"! میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

معلوم نہیں نشے کا اثر تھا یا وہ حقیقتہ" اتنی ہی مشتعل ہو گئی تھی کہ مجھے گالیاں بکنے لگی۔ میں کوئی جواب دیئے بغیر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا پھر میں نے اس "جہنم کدے" سے نکلنے میں دیر نہیں کی تھی۔

وہ رات میں نے مغل پورے میں اپنے ایک دوست کے گھر گزاری اور ناشتہ کرتے ہی علی پور کے لئے ایک بس پکڑ لی۔ دوپہر تک میں علی پور پہنچ گیا اس روز شام کو میں ناہید کو پڑھانے بڑی حویلی گیا۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ میں نے ناہید سے کہہ دیا تھا کہ جمعہ کو چھٹی کروں گا۔ اگلے روز میں اپنے ایک کارندے کے ساتھ قریبی گاؤں ڈگر روانہ ہو گیا۔ گزشتہ روز ہی میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ کون ڈگری تک میر ساتھ چل سکتا ہے! دوپہر کا کھانا کھاتے ہی میں اپنے کھیتوں کی طرف چلا گیا پھر میں نے وہیں سے بڑی حویلی کا رخ کیا تھا۔ میں جس کارندے کو اپنے لے گیا تھا' اسے راستے ہی میں ایک فرضی کہانی سنا دی تھی۔ میں نے اسے ا دشمن کا حلیہ بتانے کے بعد کہا تھا کہ اس شخص پر میرے ایک دوست کا ق ہے۔ حلیہ سن کر وہ ایک دم چونک اٹھا جسے میں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وقت تک میں نے اسے اپنے دشمن کا نام نہیں بتایا تھا۔

"اس کا نام اکبر ہے نا جی؟" کارندے نے پوچھا۔

"ہاں یہی نام ہے"۔ میں جلدی سے بولا۔ "کیا..... کیا تم اسے ج ہو؟"

"اسے کون نہیں جانتا باؤ جی! آپ بھی کمال کرتے ہیں! وہ علی پو موجود ہے' اور آپ اسے ڈگری ڈھونڈنے جا رہے ہیں!"

کارندے کی بات سن کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں نے اسے نہیں دیکھا اب تک! اگر وہ علی پور ہوتا تو مجھے بھی کہیں نہ کہیں نظر آتا نا!"

"باؤ جی! آپ کو یہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں! میرا خیال ہے جس ن آپ یہاں آئے تھے' اس سے ایک دن پہلے ملک جی نے اکبر کو کسی کام ے لاہور بھیجا تھا جہاں سے وہ چار چھ دن میں پلٹا' پھر اگلے ہی روز وہ قریبی ؤں کنجاہ کے ایک دوست کے ساتھ دوبارہ لاہور چلا گیا۔ راستے میں اس کی یپ کو حادثہ پیش آ گیا۔ سنا ہے اکبر کا دوست ہسپتال میں مر گیا۔ اکبر ایک روز لے چھٹی لے کر گاؤں آ گیا۔ اس کی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ وہ اسی لئے ہر نہیں نکل سکا۔ پھر بھلا کس طرح آپکو نظر آ جاتا!" کارندے نے تفصیل کے اتھ بتایا۔

اس کارندے کے ساتھ میں سائیکل پر سوار ڈگری کی طرف جا رہا تھا۔ علی ر سے چلے ہمیں کوئی گھنٹہ بھر ہو گیا تھا۔ ہم ناشتہ کر کے ہی چل پڑے تھے۔ رندے کے کہنے کے مطابق اب ڈگری زیادہ دور نہیں تھا۔ کارندے نے جب ھے میرے دشمن اکبر کے بارے میں بتایا تو اس وقت میں ہی سائیکل چلا رہا ا۔ میں نے سائیکل روک دی۔

"اب وہاں جا کر کیا کرنا ہے! علی پور واپس چلتے ہیں۔" میں نے سائیکل موڑتے ہوئے جواب دیا' پھر کارندے کو تاکید کی۔

"دیکھو تم یہ بات کسی کو نہ بتانا کہ میں نے تم سے اکبر کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی ہے۔"

"بہتر ہے باؤ جی' نہیں بتاؤں گا۔"

"ہاں اور یہ بتاؤ کہ اکبر کیا ملک سرفراز کا ملازم ہے؟" میں نے کارندے سے دریافت کیا۔

"ہاں جی! اکبر ملک جی کا پرانا ملازم ہے۔ ویسے باؤ جی' ایک بات بتاؤں۔

اکبر سے پیسے واپس ملنا مشکل ہی ہے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"مجھے کیا لینا اس سے!" میں نے کارندے کو ٹال دیا۔

"میں تو اپنے دوست کو اس کا پتہ بتا دوں گا۔ پھر وہ جانے اور اکبر جانے۔"

اب تک مجھے اکبر کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی تھی' ان کی روشنی میں میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ میرا ذہن یہ بات قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ ملک سرفراز نے میرے والد اور بھائی کو قتل کرایا ہو گا اور اسی کے ایماء پر میری والدہ کو بھی اغوا کیا گیا ہو گا۔ اکبر کا تعلق کنجاہ میں رہنے والے ایک شخص اللہ دتہ سے بھی تھا۔ وہاں کا زمیندار بھی ملک ہی کہلاتا تھا۔ اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ملک سرفراز کی بجائے اس تمام کارروائی کے پیچھے ملک خوشی محمد کا ہاتھ ہو۔ علی پور لوٹنے تک میرا ذہن انہی خیالوں میں کھویا رہا۔

علی پور پہنچ کر میں اپنے گھر جانے کی بجائے بڑی حویلی جا پہنچا۔ کارندے سے مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اکبر بڑی حویلی کے اس حصے میں رہتا ہے جو حویلی کے ملازمین کی خاطر مخصوص ہے۔ وہاں پہنچ کر مجھے ایک اور ہی خبر ملی۔ معلوم ہوا کہ گذشتہ رات اکبر کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ نتیجتاً صبح ہوتے ہی ملک سرفراز کی ہدایت پر اسے لاہور کے سول ہسپتال بھیج دیا گیا جہاں وہ زیر علاج تھا۔ میں گذشتہ روز ہی لاہور سے آیا تھا۔ اب اگر دوبارہ امی اور ابو سے لاہور جانے کی اجازت مانگتا تو وہ مجھے اس کی اجازت نہ دیتے۔ میں نے یہی سوچ کر کسی کو کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا اور خاموشی سے لاہور جانے کا قصد کر لیا۔

جس وقت میں بس اسٹینڈ پر لاہور جانے والی بس کا انتظار کر رہا تھا' لاہور کی طرف سے مجھے ایک تیز رفتار جیپ آتی دکھائی دی اور پھر وہ جیپ کسی طوفانی بگولے کی طرح میرے قریب سے دھول اڑاتی گزر گئی۔ جیپ خاصی تیز

ناری کے ساتھ گزری تھی' اس کے باوجود میں نے شہناز کو اس کی رائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ گذشتہ سے پیوستہ شب اس نے مجھے غیب دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اگر میں پختہ کردار کا مالک نہ ہوتا تو ں گیا ہوتا۔ اس وقت اس لئے اسے دیکھ کر میرے دل میں نفرت کی ایک لہر ابھری۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے بے عزت کر کے مجھے اپنی ٹھی سے نکال دیا تھا۔

لاہور جانے والی بس کا مجھے نصف گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ اس مرتبہ میں نے زبیگ بھی ساتھ نہیں لیا تھا تاکہ امی یا جمیلہ کو شک نہ ہو۔ شام کو پانچ بجے کے ریب میں' لاہور پہنچ گیا اور پھر میں نے میو ہسپتال پہنچنے سے پہلے لمبے پھل کا ٹکے دار ایک چاقو خرید لیا میں اب اپنے دشمن کو مزید مہلت دینا نہیں چاہتا ا۔ میری آنکھوں میں اس وقت اپنے والد اور بھائی کی خون میں تڑپتی ہوئی ئیں گھوم رہی تھیں۔

میو ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں مجھے اپنا دشمن ایک بیڈ پر نظر آ گیا اور ر نظر پڑتے ہی میرا خون کھول اٹھا۔ ملک سرفراز کا وہی باریش ملازم بیڈ کے ، بچھی ہوئی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا جس کی شکرے ایسی آنکھیں مجھے پہلی ملاقات آشنا سی لگی تھیں۔ بڑی حویلی آتے جاتے کئی بار اس سے میری مڈ بھیڑ ہوئی ہ مجھے پہچانتا تھا اور اب میں بھی اسے اکبر کے ساتھ دیکھ کر پہچان چکا تھا رات میرے والد اور بھائی کو قتل کیا گیا تھا' یہی شخص اکبر کے ساتھ س کا نام تو رشید تھا مگر ملک سرفراز اسے شیدے کہتا تھا۔

"ماسٹر جی! آپ کہاں؟ شیدے نے مجھے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"میں دراصل اپنے ایک عزیز کی تلاش میں یہاں آیا تھا جو نہیں ملا' تمہیں یکھ کر ادھر چلا آیا۔" میں نے بات بنا دی۔ "ویسے میں اسے ابھی تلاش ہا ہوں' ممکن ہے وہ کسی اور وارڈ میں ہو۔" یہ کہہ کر میں نے بیڈ پر

آنکھیں بند کئے ہوئے اکبر کی طرف دیکھا اور جان کر شیدے سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"یہ اکبر ہے جی' میرا پرانا دوست! یہ بھی حویلی ہی میں رہتا ہے' میری طرح ملک کا ملازم ہے۔" پھر وہ اکبر کو پیش آنے والے حادثے کے متعلق بتانے لگا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ اس کے بعد شیدے نے بتایا۔ "رات کو اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ صبح ملک جی کے حکم پر اسے لے کر یہاں آ گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اسے شوگر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی حالت بگڑ گئی ہے۔ اب بھی بے ہوش پڑا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو' میں ڈاکٹر سے جا کر بات کرتا ہوں۔" میں نے شیدے کو بظاہر تسلی دی اور پھر وارڈ کے ڈیوٹی روم میں پہنچ گیا۔ ڈیوٹی پر موجود ایک ڈاکٹر سے میں نے اکبر کے بارے میں بات کی تو چونک اٹھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اکبر کا بچنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہے اکبر کو اب ہوش ہی نہ آئے اور وہ اسی عالم میں انتقال کر جائے۔

اکبر میرا دشمن تھا اور مجھے اس کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر میر خود اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے قتل کرنے سے پہلے اپنی ماں کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ خود اپنی موت مر جاتا ت پھر میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کس طرح بجھتی! اسی وقت میرے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا اور میرے لہو کی گردش تیز ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

جس خیال کے سبب میری رگوں میں لہو سنسنانے لگا تھا' وہ یہ تھا کہ اگر اکبر ہوش میں نہیں آتا تو میں' شیدے کو بھی زبان کھولنے پر مجبور کر سکتا ہوں' شیدے بھی مجھے سب کچھ بتا سکتا تھا۔ شیدے مجھے ان سوالوں کے جواب دے سکتا تھا کہ میرے والد اور چھوٹے بھائی کو کیوں قتل کیا گیا؟

میری ماں کو کس کے اشارے پر اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا؟

میری ماں اب کہاں تھی؟

اور اب تک زندہ بھی تھی یا نہیں؟

خود مجھے بھی وہ لوگ کیوں قتل کرنا چاہتے تھے؟ شیدے بہرحال اس جرم ں برابر کا شریک تھا۔ اس سے بھی کوئی بات چھپی نہیں رہی ہو گی۔

وارڈ کے ڈیوٹی روم سے نکلتے ہوئے میں نے رات کو وہیں ہسپتال میں کنے کا فیصلہ کیا اور پھر شیدے کے پاس پہنچ گیا میں نے پہلے اسے تسلی دی یدے! ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں' تمہارا دوست ٹھیک ہو جائے

گا میں ذرا ابھی آتا ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ کچھ مریضوں کو یہاں سے دوسرے وارڈوں میں بھیج دیا گیا ہے میں جس مریض کی تلاش میں یہاں آیا ہوں' اگر وہ کسی اور وارڈ میں مل گیا تو رات کو مجھے بھی ہسپتال ہی میں رکنا پڑے گا۔ یہ اچھا ہوا کہ تم سے یہاں ملاقات ہوگئی' رات اچھی گزر جائے گی۔"

"اگر آپ کا مریض مل جائے ماسٹرجی تو بہت اچھا ہے" شیدے جواباً بولا۔

"میں آتا ہوں اسے دیکھ کر!" یہ کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیئے۔

"ماسٹرجی! اگر آپ کا مریض نہ ملے تو مجھے بتا ضرور جائیے گا۔" عقب سے شیدے کی آواز سنائی دی اور میں نے مڑ کر سر ہلا دیا۔

کچھ دیر ادھر ادھر وقت گزاری کے بعد میں پھر ایمرجنسی وارڈ میں آگیا۔ اس وقت ایک نرس' اکبر کے بازو میں انجکشن لگا رہی تھی۔ نرس چلی گئی تو میں نے شیدے کو مخاطب کیا۔ "وہ مل گیا' اب میں رات کو یہیں رکوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔

"اس وقت سات بج رہے ہیں۔ میں دو گھنٹے بعد آؤں گا اب! میرے مریض کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔ دو گھنٹے وہ آرام کرلے گا' پھر میں یہاں آجاؤں گا اور تم کمر سیدھی کرلینا۔"

"یہ بہت ہی اچھا ہوا ماسٹرجی! آپ کے یہاں ہونے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے خدا آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔"

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ دراصل مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں دوپہر بھی کھانا نہیں کھا سکا تھا۔ ہسپتال ہی کی حدود میں ایک ہوٹل دیکھ کر میں اس میں گھس گیا۔ کھانا تو اوسط درجے کا تھا مگر بھوک میں اچھا لگا۔ کھانا کھا کر چا پیتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ جو شخص خود ہی موت کی دہلیز تک پہنچ گیا ہے' اسے کیا مارنا! یوں بھی وہ محض آلۂ کار ہی تھا۔ اصل مجرم تو کوئی اور ہی تھا' وہ جس

ے اکبر کو قتل پر آمادہ کیا تھا۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ ے اکبر کو قتل نہیں کرنا چاہئے۔ اس فیصلے کے بعد میں بل ادا کرکے ہوٹل سے ل گیا۔ وقت گزاری کے لیے میں ہسپتال کے احاطے ہی میں ٹہلتا رہا۔ شیدے ے زبان کھلوانے کے لیے مجھے مزید کچھ وقت گزر جانے کا انتظار تھا۔ مجھے علم ا کہ گاؤں کے لوگ جلد سونے کے عادی ہوتے ہیں۔ رات کے نو بجے ان میں ے شاید ہی کوئی جاگتا ہوا ملے۔ مجھے امید تھی کہ جب میں شیدے سے کہوں گا کہ کچھ دیر باہر برآمدے میں کوئی چادر وغیرہ بچھا کر آرام کرلو تو وہ لیٹتے ہی سو ائے گا۔ پھر موقع دیکھ کر میں اس کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسے جگا کر گردن چاقو رکھ دوں گا تاکہ وہ میرے ہر سوال کا ٹھیک ٹھاک جواب دے۔

نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ میں ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اندر جاکر میں نے دیکھا کہ شیدے بینچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں قریب پہنچا تو وہ چونک اٹھا۔

"آپ ..... آپ آگئے ماسٹرجی!" اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں آگیا۔" میں بولا۔

"اب تم کوئی کپڑا لے کر ادھر باہر برآمدے میں چلے جاؤ۔ وہاں اندھیرا ی ہے۔ میں تمہیں بارہ بجے جگا دوں گا۔"

شیدے تو جیسے یہی سننے کا منتظر بیٹھا تھا فوراً" اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے ل نے بیڈ کے برابر نیچے رکھی ہوئی کپڑوں کی ایک پوٹلی کھول کر برآمدے میں بچھانے کے لیے ایک میلی سی چادر نکال لی تھی۔ شیدے برآمدے میں جاکر لیٹ گیا اور میری نظریں بے ہوش اکبر کے چہرے پر جم گئیں۔ یہی وہ شخص تھا ----- سفاک شخص جس کی گردن پر مرے بے گناہ والد اور معصوم بھائی کا خون تھا----- میرے دل میں اس کے خلاف شدید نفرت پیدا ہونے لگی۔

میرا جی چاہنے لگا کہ اس نے جس طرح میرے والد کے سینے میں چاقو اتارا تھا اسی طرح میں اس کے سینے میں چاقو اتاروں۔ لمحہ بہ لمحہ یہ خواہش تیز سے تیز ہوتی گئی خود پر قابو پانے کے لیے کہ کہیں جذبات کی رو میں' میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لوں' بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا رخ اب برآمدے کی طرف تھا۔ وہاں میں نے نیم تاریکی میں ایک جانب۔ شیدے کو لیٹے ہوئے دیکھا وہ کچھ ہی دیر میں بے خبر سو گیا تھا۔ اس سے خاصے فاصلے پر ایک اور شخص چادر اوڑھے سو رہا تھا۔

وارڈ میں ابھی کچھ چہل پہل تھی اس لئے مجھے مزید انتظار کرنا پڑا مزید ایک گھنٹہ اور گزر گیا تو تیز بلب بجھا کر ہلکی روشنی کر دی گئی اب وارڈ میں نیم تاریکی تھی اور چہل پہل بھی مفقود ہو چکی تھی اس ایک گھنٹے کے دوران میں' میں نے بیشتر وقت ٹہلتے ہوئے گزارا۔ اکبر کے قریب بیٹھ کر مجھ پر وحشت سی سوار ہونے لگتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس وحشت کے زیر اثر میں اسے قتل نہ کر دوں۔ لمبے پھل کا چاقو تو میری جیب میں موجود تھا۔

جیسے تیسے میں نے مزید کچھ وقت گزارا مگر گیارہ بجے سے کچھ پہلے ہی میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ میں برآمدے میں پہنچ گیا وہاں ہر طرف سناٹا تھا میں آہستہ قدمی کے ساتھ شیدے کے قریب پہنچ گیا اور جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا پھر اس کے قریب چادر پر بیٹھ گیا۔

"شیدا! ..... شیدے!" میں نے آہستہ آہستہ سے اسے آواز دی مگر وہ سوتا رہا۔ مجبوراً" میں نے اس کا شانہ ہلایا۔

"ہوں!"

اس نے کسمسا کر کروٹ بدلنا چاہی' مگر میں نے اسے دوسری طرف کروٹ لینے سے روک دیا۔

"شیدے! جاگو شیدے!" میں نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

بالآخر وہ جاگ ہی گیا اور اسی وقت میں نے اس کی گردن پر چاقو کی نوک رکھ دی۔

"ک ..... کون ..... کون ہو تم؟" شیدے نیم تاریکی اور غنودہ ذہن کے سبب مجھے پہچان نہ سکا۔

"میں تمہاری موت ہوں!" میں غرایا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں یہ چاقو تمہاری گردن میں نہ اتاروں تو میرے سوالوں کے جواب دینے پر تیار ہو جاؤ!"

"مم..... ماسٹرجی ..... تت ..... تم ..... یہ تم ہو ماسٹرجی!" اس نے مجھے پہچان ہی لیا۔

پھر ذرا ہی دیر میں موت کے خوف نے شیدے کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ شیدے سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا اس نے میرے سینے میں انتقام کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔ اب میں اپنے اصل دشمن کو پہچان چکا تھا۔ میرے والد اور بھائی کے قتل کا اصل ذمے دار ملک سرفراز تھا۔ میری ماں اس کی بہن تھی۔ میری ماں کا قصور یہ تھا کہ اس نے ایک کم حیثیت مزارع سے محبت کی تھی اور وہ مزارع میرا باپ تھا۔ میرے والدین کو خبر تھی کہ اگر وہ گاؤں ہی میں رہے تو کبھی ان کی محبت کو منزل نہیں ملے گی۔ وہ اسی لئے ایک رات خاموشی کے ساتھ علی پور سے فرار ہو کر وزیر آباد پہنچ گئے۔ وزیر آباد میں میرے والد کا ایک عزیز دوست رہتا تھا۔ وہیں انہوں نے شادی کر لی میرے والد کو علم تھا کہ ملک سرفرازان کا پیچھا ضرور کرے گا اور یہی ہوا۔ ملک سرفراز کو معلوم ہو چکا تھا کہ دو محبت کرنے والے اب ایک ہو چکے ہیں۔ اپنے دوست کی مدد سے میرے والد' والدہ کو ساتھ لے کر کسی طرح وزیر آباد سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی دوران میں ملک سرفراز نے میرے والد کے ماں باپ کو قتل کرا دیا اور ان کی ہم شکل جڑواں بہن کے ساتھ زبردستی اپنا نکاح پڑھوا لیا

اس طرح ملک سرفراز اپنی دانست میں میرے والد سے انتقام لے رہا تھا اگر میرے والد نے اس کی بہن سے شادی کرلی تھی تو اس نے میرے والد کی بہن سے نکاح کر لیا تھا حالانکہ اس کی پہلی بیوی موجود تھی۔ ملک سرفراز کے شقی القلب کارندے اکبر' شیدے اور دوسرے گاؤں گاؤں میرے والد کو تلاش کرتے رہے۔ میرے والد ان سے بچنے کے لیے مسلسل بھاگتے رہے۔ انہیں علم تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے میرے والد کے قتل سے چند روز پہلے ملک سرفراز کو اطلاع ملی کہ میرے والدین اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ جہلم کے ایک گاؤں میں سکونت پزیر ہیں۔ ملک سرفراز نے اس اطلاع کی تصدیق کرائی' پھر ایک رات اکبر اور شیدے کو گاؤں روانہ کر دیا۔ ان دونوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ میرے والد' مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا جائے اور میری والدہ کو اغوا کر کے علی پور لے آیا جائے۔ سو اکبر اور شیدے نے یہی کیا وہ صرف مجھے قتل کرنے میں ناکام رہے جس پر انہیں ملک سرفراز نے بہت ڈانٹا۔ میری والدہ کو ذہنی اذیت و کرب میں مبتلا کرنے کے لیے ملک سرفراز نے بتایا کہ تمہارے شوہر اور دونوں بیٹوں کو قتل کر دیا گیا ہے اکبر اور شیدے نے یہ تصدیق بھی کرا دی نتیجتاً اسی روز شدید صدمے کے زیر اثر میری والدہ نے حویلی کے پرانے کنویں میں چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی۔ ملک سرفراز کا ارادہ انہیں سسکا سسکا کر مارنے کا تھا کیوں کہ انہوں نے خاندان کی عزت کو خاک میں ملا دیا تھا' مگر ان کی خود کشی نے ملک سرفراز کی یہ ناپاک حسرت پوری نہ ہونے دی۔

شیدے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بہت عرصے تک گاؤں گاؤں میری بھی بہت تلاش کی گئی مگر میرا کوئی سراغ نہیں ملا۔

اب میں جان چکا تھا کہ ملک سرفراز مجھے کچھ اپنا سا کیوں لگا تھا! وہ بہر حال میرا ماموں تھا۔ اس کے علاوہ اب یہ بات بھی میرے لیے کوئی معمہ نہیں رہی

تھی کہ وہ اپنی دوسری بیوی‘ یعنی ناہید کی ماں پر انتہائی تشدد کیوں کیا کرتا
ناہید میری پھوپھی زاد بھی تھی اور ماموں زاد بھی! میرے والد سے اس کی ش
یقیناً“ اس لئے ملتی ہو گی کہ میرے والد ناہید کی والدہ جڑواں بھی تھے اور
شکل بھی!

سارے پردے اٹھ چکے تھے اور اب صرف ملک سرفراز کی آنکھوں
پردہ اٹھنا باقی تھی اصل مجرم کیوں کہ وہی تھا اس لئے میں نے اسے قتل کر
فیصلہ کر لیا تھا میں نے طے کر لیا تھا کہ ملک سرفراز کو قتل کرنے سے پہلے ا
ضرور بتاؤں گا کہ میں کون ہوں اور اسے کیوں قتل کر رہا ہوں! شیدے کو
نے تاکید کر دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اسے زندہ نہیں چھوڑو
شیدے یوں بھی اب جرم و گناہ کی راہ چھوڑ چکا تھا اس نے خدا اور قرآ
قسم کھا کر مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ ہر چند کہ میر
خود اپنی زبان سے شیدے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اس سے یہ ساری باتیں
پوچھ رہا ہوں اور یہ کہ میں کون ہوں‘ مگر وہ سمجھ گیا تھا اور میرے استف
اس نے اعتراف بھی کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس خونی رات کے بارے
میرے سوا کسی اور کو کس طرح کچھ علم ہو سکتا تھا!

سب کچھ معلوم ہونے کے بعد اب صبح کا انتظار تھا اس رات کا ایک
لمحہ میرے لئے عذاب بن گیا صبح ہونے سے کچھ پہلے اکبر نے دم دے
یقیناً“ اس کی قسمت میں میرے ہاتھوں قتل ہونا نہیں لکھا تھا۔ میں‘ شید
اکبر کی لاش پر آبدیدہ چھوڑ کر وارڈ سے باہر آ گیا۔ رات کے وقت بھی
ہوٹل کھلا ہوا تھا۔ صبح کے انتظار میں اور کچھ کھانے پینے کی غرض
ہوٹل میں گھس گیا۔ کچھ وقت ہوٹل میں گزارنے کے بعد میں اٹھ کھڑ
بل میں پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ اب صبح کے آثار کچھ نمایاں ہونے لگے تھے
ہسپتال کے احاطے میں نکل آیا۔

علی پور جانے والی پہلی بس کے لیے مجھے تقریباً“ ایک گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔
نو بجے کے قریب میں‘ علی پور پہنچ گیا۔ گاؤں میں داخل ہو کر میں اپنے گھر کا
ِ کرنے کی بجائے ملک سرفراز کی حویلی کی طرف بڑھا۔ وہاں تک پہنچنے کے
، مجھے چودھری افضل کے گھر کے سامنے سے گزرنا پڑتا کیوں کہ وہ راستے میں
ہ یقیناً“ میری بدقسمتی ہی کا لمحہ تھا۔ کہ جب میں‘ چودھری افضل کے گھر کے
منے پہنچا تو شہناز نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ ظالم معلوم نہیں کہاں جانے کے لیے
نے گھر سے نکل رہی تھی۔ اس نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔

”شہناز! میں اس وقت ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں‘ پلیز مجھے جانے
۔“ میں نے اس سے نرمی کے ساتھ کہا اس وقت تک وہ میرے قریب پہنچ
تھی۔

”ایسی تیسی تمہارے ضروری کام کی!“ وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح
جی۔ ”پہلے ادھر چلو تم!“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کل سے سارے گاؤں
تمہاری تلاش ہو رہی تھی۔“

”مگر کیوں؟“ میں الجھتے ہوئے ذہن کے ساتھ بولا۔ میں اس کے غصے کا
ب نہیں سمجھ سکا تھا۔

”ابھی معلوم ہو جائے گا تمہیں! اندر تو چلو!“ وہ میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہنے
۔

”برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا
۔ شہناز جھٹکے کی وجہ سے دور جا کے گری۔ اسی کے ساتھ اس نے چیخ چیخ کر
نے ملازموں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ میں اس کی پروا کئے بغیر آگے بڑھ
ا‘ مگر ابھی کچھ ہی دور چلا تھا کہ شہناز کے کئی ملازموں نے مجھے گونتھ لیا اور
لیں لے جانے لگے۔ واپسی میں گھر کے صدر دروازے پر میں نے چودھری
ضل کو بھی کھڑے دیکھا۔ میں ملازموں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے

زور آزمائی کرنے لگا مگر ظاہر ہے کہ وہ گاؤں کے رہنے والے تھے' شہر کے ب نہیں تھے جو مجھے آسانی سے چھوڑ دیتے۔

شہناز بھی زمین سے اٹھ کر اپنے بھائی کے قریب کھڑی ہوئی میری بے کا تماشا دکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی۔

ملازموں نے مجھے گھر کے اندر لے جا کر ایک نیم تاریک سی کوٹھری میں کر دیا۔ میں چیختے چلاتے ہوئے کوٹھری کا دروازہ پیٹنے لگا مگر کسی پر کوئی اثر ہوا۔ وہ کوٹھری شاید کبھی گائے بھینسوں کے چارے کے لیے استعمال ہوتی تھ مجھے تو ایسی ہی بو محسوس ہو رہی تھی اس کوٹھری میں میرے لئے سب اذیت ناک بات یہ تھی کہ وہاں چوہے بھی تھے اور چوہوں سے مجھے انتہائی محسوس ہوتی تھی بچپن میں ایک بلی کو میں نے چوہا کھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وقت سے میرے سامنے سے کوئی چوہا گزر جاتا تھا تو مجھے جھرجھری آ جاتی تھ یہاں تو ایک نہیں متعدد چوہے تھے اور میں آنکھیں بند کئے کوٹھری کے ا کونے میں سمٹا ہوا کھڑا تھا۔ چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ گیا مگر وہ لوگ تو جیسے مجھے و بند کر کے بھول ہی گئے تھے۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تو تھا کہ میرے ساتھ یہ س کچھ کیوں ہو رہا ہے لیکن شہناز اس حد تک آگے بڑھ جائے گی یہ گمان نہیں تھا۔ میں نے لاہور میں ترغیب گناہ کے باوجود شہناز کو ٹھکرا دیا تھا' ش اسی کا انتقام لے رہی تھی۔

سارے دن اور پھر ساری رات میں بھوکا پیاسا اسی کوٹھری میں بند ر دوسرے دن صبح کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر میں چیخنے لگا۔

"خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکال لو!"

مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کوٹھری کی طرف آ رہا تھا۔ قدموں آہٹ کوٹھری کے دروازے پر آ کر رک گئی۔

"چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہاں کوئی تمہاری چیخیں

والا نہیں ہے۔"

کوٹھری کے باہر سے چودھری افضل کی سخت آواز سنائی دی۔

"مگر یہ تو بتا دو خدا کے لیے میرا قصور کیا ہے؟"

میں نے اپنے لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

جواباً" چودھری افضل کے ہنسنے کی آواز آئی' پھر وہ بولا۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے میری کنواری بہن شہناز کو بے آبرو کیا ہے اور....."

"یہ سراسر جھوٹ ہے' بہتان ہے مجھ پر!"

میں اس کی بات کاٹ کر چیخ اٹھا۔

"میری بہن جھوٹ نہیں بول سکتی!"

چودھری افضل زور سے بولا پھر اس نے انکشاف کیا۔

"وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

میں یہ الزام سن کر کانپ اٹھا اور پھر مجھے شہناز کے ملازم فیض کی بات یاد آئی اس نے بتایا تھا کہ شہناز اپنے کسی کلاس فیلو کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی' جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو چودھری افضل نے اسے قتل کر دیا۔ میں سوچنے لگا' کیا مجھے بھی چودھری افضل بھوکا پیاسا رکھ کر قتل کر دینا چاہتا ہے؟

"تمہاری خاموشی اس بات کا ثبوت ہے کہ شہناز نے مجھے جو کچھ بتایا ہے' وہ سچ ہے!" چودھری افضل کی زہریلی آواز مجھے سنائی دی۔

"ہرگز نہیں!" میں تقریباً" چیخ اٹھا۔

"مجھے یہاں آئے ہوئے دن کتنے ہوئے ہیں! شہناز نے جھوٹ بولا۔
....." ابھی میری بات ادھوری ہی تھی کہ ایک چوہا میرے پیر کے قریب سے گزر گیا اور میرے منہ سے ہلکی چیخ نکل گئی اور میں سب کچھ بھول بھال کر چودھری افضل سے کہنے لگا۔ "خدا کے واسطے مجھے اس جہنم سے نکال لو!..... خدا کے

لیے!"

"اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم شہناز سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤ!" چودھری افضل نے کہا۔

"بالکل نہیں! وہ ..... وہ جھوٹ بول رہی ہے کہ ..... کہ ماں بننے والی ہے"

میں زور سے بولا۔

"میں ایک لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کرا چکا ہوں۔ وہ سچ کہہ رہی ہے' لیڈی ڈاکٹر اس کے بیان کی تصدیق کر چکی ہے۔ جھوٹی وہ نہیں' تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تو..... تو پھر وہ گناہ کا بوجھ میرا نہیں کسی اور شخص کا ہو گا۔"

"شہناز گزشتہ دنوں تمہارے سوا کسی اور سے نہیں ملی' نہ یہاں حویلی میں اس کا کوئی دوست آیا۔ وہ اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی! تم اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اسی کوٹھری میں بھوکے پیاسے سسک سسک کر مرجاؤ گے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"نہیں..... نہیں!" میں پوری قوت سے چیخنے لگا۔

"میں تمہاری آوارہ اور بدکردار بہن سے شادی نہیں کروں گا' ہرگز نہیں!"

"تو پھر مرجاؤ بھوکے پیاسے!"

چودھری افضل کے لہجے میں سفاکی تھی۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں۔ دور ہوتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ چودھری افضل میرا انکار سن کر واپس رہا تھا۔

چودھری افضل کے دور ہوتے قدموں کی آواز معدوم ہو گئی تو مجھے ا بے بسی پر رونا آگیا۔ اسی کے ساتھ مجھے شہناز ایک بات یاد آئی۔ اس

ہو ر جاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا' تم مجھے نہیں جانتے فیروز' ورنہ میری محبت کو ٹھکرانے کی ہمت نہ کرتے! میری بات یاد رکھنا کہ جو چیز مجھے سیدھی طرح نہیں تی میں اسے چھین لیتی ہوں۔

"ایسا نہیں ہو سکتا!" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

"میں اپنی جمیلہ سے بے وفائی نہیں کر سکتا!"

مجھے یاد آیا کہ میں گزشتہ روز کچھ کہے سنے بغیر گھر سے چلا آیا تھا اور اب تک واپس نہیں پہنچا تھا۔ امی ابو اور جمیلہ کتنے فکر مند ہوں گے' ان کا کیا حال ہو گا' یہ سوچ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ سارا دن بھی کرب و اذیت میں گزر گیا۔ شام ہوتے ہوتے مجھ پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی گزشتہ روز صبح ناشتہ کرنے کے بعد کچھ نہیں کھایا تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی بچانے کے لیے تو حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے۔ اگر میں زندہ نہیں رہا تو جمیلہ کا کیا ہو گا؟ وہ تو جیتے جی مرجائے گی اس کے ساتھ مجھے ایک اور خیال آیا۔ قانون اور مذہب دونوں ہی نے مجھے وہ حق دیا تھا اور میں اس حق سے فائدہ اٹھا کر شہناز سے پیچھا چھڑا سکتا تھا۔

میں اب انتظار کرنے لگا کہ کوئی اس کوٹھری کی طرف آئے۔ دور تک سناٹا طاری تھا۔ وہ کوٹھری شاید گھر کے کسی دور افتادہ حصے میں تھی اس لئے کوئی ادھر سے نہیں گزرتا تھا میرے کان کوئی آہٹ سننے کے منتظر رہے۔ نقاہت کی وجہ سے اب میرے ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی میں اپنی قوت ارادی کے بل پر خود کو ہوش و حواس میں رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک میری سماعت سے کسی کے قدموں کی چاپ ٹکرائی اور میں چونک اٹھا قدموں کی چاپ کوٹھری ہی کی طرف بڑھ رہی تھی میں کوٹھری کے فرش پر بے سدھ پڑا تھا قدموں کی چاپ سن کر میں کوٹھری کے دروازے کی طرف

آہستہ آہستہ گھٹنے لگا۔ میرے جسم میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکتا یا کھڑا ہو سکتا۔

بہت سے قدموں کی چاپ کوٹھری کے دروازے پر آکر رک گئی' پھر مجھے شہناز کی آواز سنائی دی "فیروز!..... فیروز!" وہ مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے اپنے جسم کی پوری قوت صرف کر کے اسے جواب دیا "شہناز!" میری آواز بہت دھیمی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ کوٹھری کے باہر نہ سنی جا سکے۔

"تم اب بھی اپنے صبح والے فیصلے پر قائم ہو اور اسی کوٹھری میں بھوکے پیاسے مرجانا چاہتے ہو یا پھر مجھ سے شادی کرنے کے لیے آمادہ ہو؟" شہنار نے سوال کیا۔

"میں آخری بار تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں۔ تمہارا جواب اگر اب بھی انکار میں ہوا تو پھر کوئی اس کوٹھری کی طرف نہیں آئے گا' جب تک تم مر نہیں جاؤ گے! بولو مجھ سے شادی کرو گے؟"

"ہاں..... ہاں شہناز!" میں نے بہ مشکل قرار کیا۔

"کوٹھری کا دروازہ کھول کر اسے باہر نکال لو!" شہناز نے غالباً" اپنے ساتھ آنے والے ملازمین کو حکم دیا۔

کوٹھری کا دروزاہ جلد کھل گیا اور دو افراد اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے میرے دونوں بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر مجھے کوٹھری کے فرش سے اٹھایا اور پھر تقریباً" گھسیٹتے ہوئے کوٹھری سے نکال لیا۔

"ارے! اس کی یہ کیا حالت ہو گئی!" شہناز مجھ پر نظر پڑتے ہی بولی۔

"اس کی آواز میں تاسف تھا۔" اس نے اپنے ملازمین سے کہا۔

"اسے میرے کمرے میں لے چلو!"

کچھ ہی دیر بعد میں ایک نرم و گداز بستر پر پڑا ہوا تھا اور شہناز میرے

ہونٹوں پر پھلوں کا رس ٹپکا رہی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر منہ کھول دیا۔ پھر مجھے چمچے سے پھلوں کا رس پلایا جانے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے منہ میں آب حیات ٹپکایا جا رہا ہو۔ آہستہ آہستہ میں نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔

"فیض توں جا' بھا افضل نوں بلا کے لا!" شہناز نے اپنے ملازم کو حکم دیا۔

"اچھا بی بی جی!"

ملازم یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شہناز مجھے پھر رس پلانے لگی۔ پھر اس نے مجھے شہد کے دو بڑے چمچے بھی دیئے۔ اس کے بعد وہاں موجود کسی ملازم کو چکن سوپ لانے کو کہا۔ رفتہ رفتہ میری حالت سدھرنے لگی۔ جلد ہی شہناز کا بڑا بھائی چودھری افضل وہاں پہنچ گیا اور حیرت سے کہنے لگا۔ "ارے تو اسے کوٹھری سے یہاں کیوں اٹھا لائی؟"

"یہ راضی ہو گیا ہے بھا افضل!" شہناز کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

"پر صبح تو یہ بڑی بڑکیں مار رہا تھا!" چودھری افضل آہستہ سے ہنس کر بولا۔ "اس کے سارے کس بل دوسرے ہی دن نکل گئے!"

"بھا افضل اب تم جلدی سے مولوی کو بلواؤ' میں چاہتی ہوں آج ہی رات اس سے میرا نکاح ہو جائے۔"

"پر شہناز' اب تو بڑی رات ہو گئی ہے' مولوی تو اب تک سو گیا ہو گا۔ دس بجنے والے ہیں!"

"جب وہ سنے گا کہ اسے چودھری افضل نے بلوایا ہے تو اس کی نیند غائب ہو جائے گی تم نے آج اسے دن میں بلا کر بات کی تھی تاکہ کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے' وہ تیار رہے۔ پھر اسے بلانے میں کیا حرج ہے۔ اسے حکیمے کو بھیج دو!" شہناز نے کہا۔

"جا بھئی حکیمے' بلا لا مولوی کو!"

چودھری افضل نے وہاں موجود ایک ملازم کو اپنے پاس بلا کر سرگوشیوں میں کچھ بات کرنے لگا۔ جواباً شہناز بھی آہستہ آواز میں بات کرتی رہی۔ اسی دوران میں ایک ملازم چکن سوپ لے آیا۔

"میں ذرا اسے سوپ پلا دوں بھا افضل!" شہناز مسہری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

پہلے تم مجھے الماری سے اسٹامپ پیپر نکال کر دے دو جو میں نے آج منگوا کر تمہارے پاس رکھوایا تھا۔" چودھری افضل نے شہناز سے کہا۔

"اچھا۔" کہہ کر شہناز الماری کی جانب بڑھ گئی اور اسے کھول کو مطلوبہ اسٹامپ پیپر نکال لائی اور چودھری افضل کو تھما دیا۔

"تم اتنے اسے ہوش و حواس میں لاؤ' میں دوسری تیاریاں کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر چودھری افضل کمرے سے نکل گیا۔

میں اس اسٹامپ پیپر اور دوسری تیاریوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ شہناز اب میرے سرہانے بیٹھی مجھے چمچے سے چکن سوپ پلا رہی تھی۔ مین اب خود کو پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

"اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرو! میں تمہیں سہارا دے کر اٹھاتی ہوں۔" شہناز نے مجھ سے کہا اور پھر سہارا دے کر مجھے اٹھانے لگی۔

"بیٹھنے کے بعد مجھے چکر سے آنے لگے اور میں نے شہناز سے کہا۔ "مجھے لٹا دو شہناز! چکر آ رہے ہیں۔"

اس نے مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ ذرا دیر بعد چودھری افضل وہاں آ گیا اور شہناز سے پوچھا۔ "اب اس کا کیا حال ہے؟"

"پہلے سے خاصا بہتر ہے مگر ابھی یہ بیٹھنے کے قابل نہیں' اسے چکر آ رہے ہیں۔" شہناز نے بتایا۔

"پھر تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔" چودھری افضل بولا "مولوی آ گیا ہے۔ میں نے ڈرائنگ روم میں سارا بندوبست کر دیا ہے' وہیں نکاح پڑھایا جائے گا کم سے کم اسے اس قابل تو ہونا ہی چاہئے کہ سہارا لے کر کچھ دیر بیٹھ سکے۔"

"کچھ دیر تو انتظار کرنا ہی پڑے گا بھا افضل!" شہناز بولی "اتنے تم مولوی سے نکاح نامے کی خانہ پری کراؤ اس میں بھی تو وقت لگے گا نا!"

"ہاں ٹھیک ہے۔" چودھری افضل نے اپنی بہن کے مشورے سے اتفاق کیا اور پھر اس کمرے میں موجود فیض اور دوسرے ملازم کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اب کمرے میں شہناز اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ پیالے میں کچھ سوپ اور باقی تھا' شہناز نے وہ بھی مجھے پلا دیا۔

چند منٹ کے بعد شہناز نے مجھے پھر سہارا دے کر اٹھایا اور اس بار چکر نہیں آئے۔ ہاں ذہن پر غنودگی کا غلبہ ضرور تھا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ میں گزشتہ شب سو نہیں سکا تھا' پھر دو دن بھوکا رہنے کے بعد میں نے سوپ وغیرہ پیا تھا۔

"اگر تم اٹھ کر کھڑے ہو سکتے ہو تو میرے سہارے باتھ روم تک چلو اور منہ دھولو!" شہناز نے مجھ سے کہا۔

"کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے بستر سے پاؤں لٹکا دیئے۔ شہناز نے مجھے سہارا دیا اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پھر شہناز مجھے سہارا دیئے بہت آہستہ آہستہ باتھ روم تک لے گئی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے پڑنے سے غنودگی قدرے کم ہو گئی تولیہ سے منہ پونچھ کر میں دوبارہ بستر پر آ کے لیٹ گیا۔ باتھ روم سے واپسی میں بھی مجھے شہناز ہی سہارا دے کر مسہری تک لائی تھی۔

مجھے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ چودھری افضل پھر کمرے میں آ گیا اور شہناز سے میری کیفیت دریافت کرنے کے بعد مطمئن انداز میں سر

نے لگا۔" ٹھیک ہے' اب اسے ڈرائنگ روم میں لے جایا جا سکتا ہے۔ یہ گاؤ یے کے سہارے بیٹھ سکے گا۔" یہ کہہ کر چودھری افضل مجھ سے مخاطب ہوا " روز! یہ دیکھو۔ اس نے مجھے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر دکھایا۔" میں اپنے یوالور کی نال تمہارے پہلو سے لگا کر بیٹھوں گا اگر تم نے عین موقع پر کسی بھی ب انکار کر دیا نکاح سے تو میں تمہیں گولی مار دوں گا! سمجھ گئے!"

"ریوالور اپنی جیب میں رکھ لو چودھری افضل! اس کی ضرورت نہیں ے گی۔ میں شہناز سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوں۔" میں نے چودھری افضل کو ین دلایا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" چودھری افضل بولا اور اس نے مجھ سے اٹھنے و کہا۔

شہناز نے اٹھنے میں میری مدد کی' پھر اپنے بھائی سے بولی۔ "اسے سہارا ے کر ڈرائنگ روم تک لے جانا پڑے گا بھا افضل"

"چل تیری خاطر یہ بھی سہی!" چودھری افضل ہنس کر بولا اور پھر مجھے ہارا دے کر مسہری سے اتارنے لگا "آ بھئی میرے ہونے والے بہنوئی! تو بھی ایاد کرے گا کسی سے پالا پڑا تھا۔"

شہناز اپنے بھائی کی بات سن کر ہنس پڑی' پھر بولی۔ "ابھی مجھے بھی تو دلہن اہے۔!"

"ضرور بنو دلہن! پھر کبھی کیا خبر ایسا موقع ملے نہ ملے!" چودھری افضل یہ ہ کر زور سے ہنسا اور مجھے سہارا دیئے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے

ڈرائنگ روم وہاں سے خاصا دور تھا۔ بہر حال چودھری افضل مجھے سہارا یے وہاں تک پہنچ گیا وہاں میں نے فرش پر قالین بچھا ہوا دیکھا ایک جانب دو ں گاؤ تکیے رکھے تھے جن میں سے ایک پر کہنی ٹیکے ایک ادھیڑ عمر باریش شخص

بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں اس کے حلیے سے سمجھ گیا کہ وہی مولوی ہے اس شخص کے سامنے کچھ فاصلے پر چار پانچ ملازمین بیٹھے تھے۔ چودھری افضل نے مجھے مولوی کے قریب بٹھا دیا میرے پیچھے گاؤ تکیہ رکھا تھا میں نے اس سے ٹیک لگالی چودھری افضل میری دوسری جانب مجھ سے بالکل لگ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں مولوی جی' اب نکاح پڑھا دو!" چودھری افضل نے مولوی کو مخاطب کیا۔ اس کا لہجہ حکمیہ تھا۔

"بہتر ہے چودھری صاحب!" مولوی فوراً" بول اٹھا۔ شہناز کے کمرے سے ڈرائنگ روم تک آنے کے سبب مجھے پھر چکر سے آنے لگے۔ ذہن پر دوبارہ غنودگی کا غلبہ بھی ہونے لگا تھا۔ شاید میں اسی سبب مولوی کی آواز واضح طور پر سننے کا اہل نہیں تھا۔

"ارے! تم تو اونگھ رہے ہو۔" میں نے چودھری افضل کی درشت آواز سنی۔ "مولوی جی کیا کہہ رہے ہیں' جواب دو اس کا!"

میں چونک کر سیدھا بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت مولوی نے مجھ سے کہا۔ "ہاں کہو مجھے قبول ہے۔"

"مجھے قبول ہے۔" میں نے جلدی سے کہہ دیا حالانکہ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ مولوی نے اس سے پہلے کیا کہا تھا!

مولوی نے پھر مزید دو مرتبہ سے "قبول ہے۔" کہلوایا اور پھر میرے سامنے نکاح نامہ رکھ دیا۔

"یہاں دستخط کردو! یہ لو قلم!"

اسی وقت مجھے زور کا چکر آیا۔ معلوم نہیں چودھری افضل کیا سمجھا اس۔ میرے پہلو سے ریوالور کی نال لگا دی اور کسی درندے کی طرح غرایا۔ "د... کرتے ہو نکاح نامے پر یا....."

اس نے دھمکی آمیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ریوالور کی نال کا باؤ میرے پہلو پر ڈالا۔

موت کے خوف سے میں نے اپنی بند ہوتی آنکھیں پوری طرح کھول دیں ور جہاں جہاں مولوی نے کہا' دستخط کر دیئے۔ نکاح نامے کے علاوہ اس نے مجھ سے اسٹامپ پیپر اور اس کی نقل پر بھی دستخط کرائے تھے۔ ظاہر ہے میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس اسٹامپ پیپر پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ سکتا۔ میں نے سوچا' پھر پڑھ لوں گا شہناز سے لے کر کہ اس اسٹامپ پیپر پر کیا لکھا گیا ہے!

میں نے دستخط کر دیئے تو مولوی نے چودھری افضل سے کہا کہ چودھری صاحب! اب بی بی جی کے دستخط کرا لائیں۔ اس نے نکاح نامہ اور اس کی نقول چودھری افضل کو تھما دیں چودھری افضل نکاح نامہ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ موقع غنیمت جان کر میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں شاید سو گیا تھا کہ مجھے چودھری افضل نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ " سیدھے ہو کر بیٹھو۔"

اسی وقت مولوی قرآنی آیات پڑھنے لگا' پھر اس نے دعا کی' اس کے بعد چودھری کو مبارکباد دینے لگا۔

جواباً" چودھری افضل نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اسے تھما دیئے اور اپنے ایک ملازم کو حکم دیا۔ "مولوی جی کو جا کر چھوڑ آ" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب تم بھی اٹھو' یہاں کب تک بیٹھے رہو گے! شہناز تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اٹھانے لگا۔

پھر جیسے تیسے میں' چودھری افضل کا سہارا لئے شہناز کی خواب گاہ میں پہنچ ہی گی۔ شہناز پر نظر پڑتے ہی میری ساری نیند جیسے غائب ہو گئی اس نے سرخ کامدار شرارہ سوٹ پہن رکھا تھا' چہرے پر خوبصورت میک اپ تھا اور وہ زیور بھی پہنے ہوئے تھی۔ وہ اس لباس میں واقعی دلہن معلوم ہو رہی تھی چودھری

فضل نے اس دوران میں مجھے مسہری پر لٹا دیا شہناز بھی اسی مسہری پر بیٹھی تھی۔

"لے بھئی شہناز' مبارکاں!" چودھری افضل نے اپنی بہن کو مخاطب کیا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ابھی وقت ہے رات کے گیارہ تو بجے ہیں! تم اپنی سہاگ رات یہاں منانے کی بجائے لاہور ہی میں کیوں نہ مناؤ! ہم لوگ اب چلیں تو دو بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے۔"

"مگر اس کی حالت تو سدھرے!" شہناز نے میری طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو ابھی سے غش کھائے جا رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی پھر میری طرف بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی اور مزید بولی۔

"سارا وقت تو لاہور پہنچتے پہنچتے گزر جائے گا' پھر کیا خاک سہاگ رات ہو گی! کل رات لاہور چلیں گے۔"

"اچھا تو پھر میں چلا!" چودھری افضل مسکرا کر بولا۔

"ویسے اس وقت تو تیرا دولھا بھلا چنگا لگ رہا ہے' نکاح کے وقت تو یہ بار بار اونگھ رہا تھا۔"

چودھری افضل چلا گیا تو شہناز نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا' پھر میرے پاس آ کر مسہری پر بیٹھ گئی۔ اس نے کوئی مسحور کن سینٹ لگایا تھا۔

"فیروز!" شہناز نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں تمہیں اس وقت کیسی لگ رہی ہوں۔" اس کے لہجے میں وارفتگی اور خودسپردگی سبھی کچھ تھا۔

"تم ..... تم اچھی لگ رہی ہو۔" میں نے اعتراف کیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا فیروز کہ جو چیز مجھے سیدھی طرح نہیں ملتی' میں سے چھین لیتی ہوں! دیکھ لو کہ میں نے آخرکار تمہیں تمہاری محبوبہ جمیلہ سے چھین لیا نا!"

جمیلہ کے ذکر پر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں تلخ لہجے میں

بولا۔ ”شہناز! میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو! تم لوگوں نے مجھے دھوکا دیا ہے تم نے زبردستی مجھ سے نکاح پڑھوایا ہے۔“

”بکو مت! تم نے اپنی مرضی سے نکاح کیا ہے میرے ساتھ!“ اس نے کہا پھر ذرا توقف سے نرم لہجے میں کہنے لگی ”فیروز! آج کی رات کو ایسی تلخ باتوں میں نہ گنواؤ آؤ ہم دونوں مل کر اس رات کے ایک ایک لمحے کو امر بنا دیں۔“ یہ کہتے ہوئے شہناز نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اسے ایک مرد کو تسخیر کرنے کے سارے ہنر آتے تھے پھر لاشعوری طور پر میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ شہناز بہرحال اب میری بیوی بن چکی ہے اور میں کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو رہا۔ اس نے مجھے فتح کر ہی لیا مجھے اعتراف ہے کہ شہناز سے شدید نفرت کے باوجود ان لمحات نے میرے سارے وجود کو مہکا دیا۔ پھر ساری رات میں رنگ اور خوش بو کی برسات میں نہاتا رہا۔ خبر نہیں کب نڈھال ہو کر میری پلکیں نشہ آسودگی سے بوجھل ہونے لگیں اور میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو کمرے میں تنہا پایا۔ میری نظر کمرے کے دروازے کی طرف اٹھی جو بند تھا میں مسہری سے اٹھ کر دروازے تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ شہناز سے نکاح ہو جانے کے باوجود ابھی میری حیثیت وہاں ایک قیدی ہی کی سی تھی میں دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گیا اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ دوپہر کے دو بجنے والے تھے میں گزشتہ رات پیش آنے والے واقعات کے متعلق سوچنے لگا کہ گزشتہ شب جو کچھ بھی ہوا تھا وہ قانوناً اور مذہباً ”گناہ نہیں تھا“ اس کے باوجود میں اپنی روح پر گناہ کا ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔

میں انہیں خیالوں میں سرگرداں تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور شہناز اندر آ گئی اس کے لبوں پر بڑی فاتحانہ مسکراہٹ تھی معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ نہائی تھی۔ اس کے شانوں پر زلفیں بکھری ہوئی تھیں اس

نظر پڑتے ہی گزری ہوئی رات کے کئی منظر میری آنکھوں میں گھوم گئے اور مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت سی طاری ہونے لگی وہ چست پینٹ اور شرٹ پہنے ہوئے تھی قدم قدم چلتی ہوئی وہ مسہری کے قریب آ گئی۔

”شہناز!“ میں نے خواب آلودہ سی آواز میں اسے پکارا اور پھر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”فیروز! میری زندگی!“ شہناز نے بھی وارفتگی کا اظہار کیا۔

اسی وقت کسی کے قدموں کی چاپ ابھری میں نے چونک کر دیکھا کمرے میں داخل ہونے والا شہناز کا ملازم فیض تھا۔

”بی بی جی! کھانا لے آؤں؟“ فیض نے شہناز کو مخاطب کیا۔

”ابھی ذرا ٹھہرو! فیروز کو نہا لینے دو۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے ہمکلام ہوئی۔ ”جاؤ فیروز! باتھ روم ہو آؤ پھر کھانا کھائیں گے۔“

میں باتھ روم میں چلا گیا۔

اسی روز سورج غ.ب ہوتے ہی چودھری افضل، شہناز اور میں لاہور روانہ ہو گئے ہمارے ساتھ فیض بھی تھا چودھری افضل جیپ ڈرائیو کر رہا تھا ہر چند کہ اندھیرا ہو چکا تھا اس کے باوجود چودھری افضل نے یہ احتیاط برتی تھی کہ کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے مجھے ایک بڑی سی چادر اوڑھا دی گئی تھی اور چودھری افضل نے مجھ سے اپنا چہرہ چادر میں چھپا لینے کے لیے بھی کہا تھا۔ اگلی سیٹ پر چودھری افضل کے برابر شہناز سرخ ساڑھی میں ملبوس بیٹھی تھی۔ مجھے پچھلی سیٹ پر فیض کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔

رات کو دس بجے کے قریب ہم لاہور پہنچ گئے اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ کوٹھی میں امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم کا منیجر بھی موجود تھا چودھری افضل نے اس سے مجھے ملوایا اور تاکید کی کہ وہ مجھے فرم کے تمام معاملات اور کاروباری رموز سمجھائے۔ آئندہ روز سے مجھے دفتر جانا تھا۔

اس موقع پر شہناز بول اٹھی۔ اس نے چودھری افضل سے کہا۔ "ابھی کچھ دن ہمیں ہنی مون تو منا لینے دو۔ فیروز چند روز بعد دفتر جانے لگے گا۔"

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی!" چودھری افضل راضی ہو گیا، پھر فرم کے منیجر سے مخاطب ہوا۔ یہ اب مستقل طور پر یہیں رہیں گے اس لیے کل سے تم اپنے رہنے کا کہیں اور بندوبست کر لو!"

"بہتر ہے چودھری صاحب!" وہ سعادت مندی سے بولا۔ "کل صبح میں یہاں سے اپنا سامان لے جاؤں گا۔"

"اور ہاں یہاں سے کوئی نوکر تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔" چودھری افضل نے مزید کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

منیجر چلا گیا تو چودھری افضل نے شہناز سے کہا۔ "کیا خیال ہے شہناز! فیروز کو اس اسٹامپ پیپر اور نکاح نامے کی نقل دے دی جائے؟"

"ہاں اب کوئی حرج نہیں، یہ ایک ہی رات میں راہ راست پر آ چکا ہے مگر اسے ایک بات اور بتا دو، وہی جو تم نے آج دوپہر کو مجھ سے کی تھی!" شہناز کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"تو بھئی سنو فیروز! چودھری افضل مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم اب کسی بھی صورت علی پور کا رخ نہیں کرو گے! اگر تم نے یہ کوشش کی تو اس کا نتیجہ بہت برا ہو گا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے احتجاج کیا۔ "کیا میں اپنے گھر والوں سے نہیں مل سکتا؟"

"ہرگز نہیں! تمہیں اس کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔" چودھری افضل کا لہجہ فیصلہ کن تھا پھر وہ بولا۔ "لو، یہ اسٹامپ پیپر اور نکاح نامہ بھی غور سے پڑھ لو۔" اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "نکاح نامے کے اندراجات اور اسٹامپ پیپر پڑھ کر یقیناً" تمہارے دل میں پیدا ہونے والے

باغیانہ جذبات سرد پڑ جائیں گے۔" چودھری افضل کی آواز میں چبھن تھی پھر اس نے نکاح نامے اور اسٹامپ پیپر کی نقول میری طرف بڑھا دیں جن پر میں دستخط کر چکا تھا۔

میں نے دونوں چیزیں اس سے لے لیں۔ پھر انہیں پڑھ کر میرا خون کھول اٹھا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چودھری افضل مجھے اس بری طرح پھانس لے گا، وہ میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ کرے گا!



میری نگاہیں ایک بار پھر نکاح نامے پر مرکوز ہوگئیں۔ حق مہر
لاکھ روپے باندھا گیا تھا۔ نکاح نامے کی شق نمبر بیس میں نان نفقے کے
اسٹامپ پیپر پر موجود عبارت کا مختصر اندراج بھی تھا۔ اس کے مطابق
ماہانہ اخراجات شہناز کو طلاق دینے کی صورت میں مجھے پانچ ہزار روپے
کرنا تھے۔

یہ میرے ساتھ دھوکہ ہے کھلا فریب! میں چیخ اٹھا۔

تمہیں اس وقت کہنا تھا جب تمہارا نکاح پڑھایا جارہا تھا۔ چودھری ا
چبھتے ہوئے لہجے میں بولا..... میں اس وقت پوری طرح اپنے حواس
نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ میں جانتا ہوں کہ اس طرح تمہارا کیا مقصد ہے
چاہتے ہو کہ میں شہناز کو طلاق نہ دے سکوں۔ ظاہر ہے کہ نہ میں دس
روپے مہر ادا کرسکتا ہوں۔ اور نہ بطور نان نفقہ پانچ ہزار روپے ماہانہ
کرنے کا اہل ہوں۔ تو پھر صبر کرو اب چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔

چودھری افضل۔سرد لہجے میں بولا۔

زندگی میں پہلی بار مجھے کسی ایسے واقعہ سے سابقہ پڑا تھا اس
میرا ذہن چکرا کر رہ گیا تھا میرے مشاہدے میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں

ات اور مشاہدات تو عمر سے حاصل ہوتے ہیں اور ابھی میری عمر ہی کیا
! میرے ذہن میں یہی آیا کہ مجھے بری طرح پھانس لیا گیا ہے اور اب کوئی
ار کی راہ نہیں میں نے سوچا تھا کہ شہناز کو طلاق دے کر مجھے نجات مل
ے گی مگر اب میرے نزدیک یہ ناممکن تھا۔ شہناز کو طلاق دینے کے لئے
دس لاکھ روپے کہاں سے لاتا! پھر پانچ ہزار روپے ماہانہ الگ تھے۔

"بھا افضل! تم فکر نہ کرو' فیروز کو سمجھا لوں گی۔" شہناز بولی۔ "یہ
ی غصہ ہے جو دو ایک روز میں اتر جائے گا۔"

"تم ہی اسے سمجھا لو تو اچھا ہے ورنہ سمجھانے کے لئے میرے پاس
ر بھی بہت سے طریقے ہیں!" چوہدری افضل نے سخت لہجے میں کہا اور پھر
ھ کھڑا ہوا۔

ہم سب کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چوہدری
فضل اپنے کمرے میں سونے چلا گیا اور شہناز مجھے اسی کمرے میں لے آئی
اں میں پہلے بھی ایک بار آ چکا تھا۔

"فیروز! تمہیں یہ کمرہ تو یاد ہو گا!" شہناز پھولوں سے سجی سیج کی
رف بڑھتے ہوئے بولی۔ "یہی وہ کمرہ ہے جہاں میں نے پہلی بار تمہارے
رب کی خواہش کی تھی۔ اس رات اس کمرے کے درودیوار نے میری تشنگی
کا تماشا دیکھا تھا اور آج رات یہ ....." نہ معلوم کیوں شہناز نے اپنا جملہ
ادھورا چھوڑ دیا۔ میں اس وقت قطعی نہ سمجھ سکا کہ شہناز کے کیا ارادے
ہیں!

آج رات میں گزشتہ رات کی نسبت زیادہ تر و تازہ تھا۔ میری نیند

بھی پوری ہو چکی تھی اور میں نڈھال بھی نہیں تھا کمرے کی فضا ہی کچھ ایسی تھی کہ شہناز سے نفرت و غصے کے باوجود میرے وجود میں ایک ہیجان سا پیدا ہونے لگا۔

"فیروز!" وہ جیسے میرے کان میں گنگنائی اگر بھا افضل نے میری اور تمہاری جدائی کی راہیں مسدود کر دی ہیں تو اس میں خفگی کی کیا بات ہے یہ تو اچھی بات ہے۔"

میں کچھ نہ بولا کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ خاموشی کی زبان میں گفتگو اچھی لگتی ہے اور یہ لمحات بھی ایسے ہی تھے مجھ پر شہناز کے قرب کا جادو چلنے لگا تھا میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس دیار میں پہنچ جاؤں جہاں رنگ ہی رنگ ہیں' خوشبو ہی خوشبو ہے۔ میرے حواس پر بے خودی سی طاری ہونے لگی پھر اس سے پہلے کہ میں اس بے خودی کے عالم میں جسم و جاں کے سارے فاصلے سمیٹ لیتا وہ تڑپ کر میرے پہلو سے اٹھ گئی میری حالت کسی ایسے تشنہ لب کی سی تھی جسے ٹھنڈے میٹھے پانی کا پیالہ دے کر سیراب ہونے سے پہلے پیالہ چھین لیا جائے۔

"شہناز!" میں جیسے خواب کے عالم میں بولا۔ "ادھر آؤ شہناز! میرے پاس ..... میرے قریب آ جاؤ۔" میرے لہجے میں التجا تھی۔

"نہیں!" وہ مسہری کے قریب کھڑی ہوئی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

"مگر کیوں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"یہ ظلم ہے۔" میں نے فریاد کی۔

"آج رات میں اس کمرے کے درودیوار کو تمہاری تشنگی کا تماشا دکھانا چاہتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر تم نے بھی تو مجھ پر ظلم کیا تھا! میں تم سے اسی ظلم کا بدلہ لے رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"میں آج رات دوسرے کمرے میں سوؤں گی۔"

"ہرگز نہیں!" میں چیخ اٹھا اور پھر مسہری سے اٹھ کر تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

شہناز کے لیے میری یہ دیوانگی یقیناً غیر متوقع نہیں رہی ہو گی۔ اسے اندازہ ہوگا کہ میں اس کو زبردستی بھی روک سکتا ہوں۔ وہ اسی لئے تیزی کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی پھر میں نے باہر سے دروازہ لگائے جانے کی آواز سنی۔ ممکن ہے کہ عالم دیوانگی میں زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیتا کہ مجھے ہوش آ گیا۔

"یہ میں کس کے لیے اس قدر دیوانہ ہو رہا ہوں؟" میں نے خود سے سوال کیا۔ ایک ایسی عورت کے لئے جس نے مجھ سے میری جمیلہ کو دور کر دیا ہے اس ظالم کے لیے جس نے زبردستی مجھ سے شادی کر لی ہے! "نہیں ..... ہرگز نہیں!" میں بڑبڑانے لگا۔

"وہ ..... وہ مجھے ہوش و خرد سے بیگانہ کرنا چاہتی ہے اور ..... اور مجھے اپنا دیوانہ بنا لینا چاہتی ہے، مگر میں ..... میں اس کے دام حسن میں نہیں آؤں گا!"

دیر تک میں خود پر ملامت کرتا رہا۔ اسی سبب جذبات کا چڑھا ہوا

ریا اتر گیا اس کے باوجود میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا اور مجھے بڑی مشکل سے نیند آئی۔

میں بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی کمرے میں ہلکا نیلا بلب جل رہا تھا۔ اسی کی مدھم روشنی میں مجھے شہناز کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آتی دکھائی دی کمرے کا دروازہ کھلنے ہی سے شاید میں جاگ اٹھا تھا۔ شہناز کو میں نے مسہری کی طرف آہستگی سے بڑھتے دیکھا۔ اس سے پہلے وہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر چکی تھی۔ میں ایسا بن گیا جیسے سو رہا ہوں وہ خاموشی سے آ کر مسہری پر لیٹ گئی اس نے اب تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی کہ جس سے میری نیند اچٹ جائے۔ خلاف توقع وہ انتہائی پرسکون معلوم ہو رہی تھی۔ میں .... سمجھ گیا کہ غالباً اب صبح ہونے والی ہو گی اور شہناز کسی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی ہو گی کہ وہ کسی اور کمرے میں سوئی تھی۔

صبح مجھے شہناز ہی نے جگایا۔ میں نے دانستہ اپنی خفگی کے اظہار کی خاطر اس سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نہا کر غسل خانے سے نکلا تو اس نے ہی مجھے مخاطب کیا۔ "یہ تمہارا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ میرے قریب آ کر مجھے گدگدانے لگی۔ "گک ..... کیا کر رہی ہو یہ! ہٹو نا۔" میں اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا۔

"اب نظر آئے نا تمہارے دانت!" وہ ہنس کر بولی۔

"یہی تو دیکھنا چاہتی تھی میں!"

پھر ناشتہ کرنے کے بعد چوہدری افضل' علی پور چلا گیا جیپ وہ چھوڑ گیا تھا اپنی روانگی سے قبل اس نے ایک بار پھر مجھے تاکید کی تھی کہ علی پور ہرگز نہ آنا ورنہ سخت نقصان اٹھاؤ گے!

چوہدری افضل گاؤں چلا گیا تو شہناز مجھے اپنے ساتھ بازار لے گئی اور ڈھیروں ریڈی میڈ کپڑے میرے لیے خرید لئے۔ ان میں سوٹ بھی تھے' پینٹ شرٹ بھی اور قمیض شلوار بھی! میں نے منع بھی کیا کہ اتنے کپڑوں کا کیا ہو گا' رہنے دو مگر وہ نہیں مانی۔ اس نے کہا۔

"تم میرے شوہر ہو' ایک امیر و کبیر بیوی کے شوہر! تمہیں روز کپڑے بدلنا چاہئیں!"

میں چپ ہو گیا۔ اس نے میرے کپڑوں کے لئے دو بڑے سوٹ کیس بھی خریدے۔ اس کے علاوہ ضرویات کا دیگر سامان بھی خریدا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر مجھے جمیلہ سے محبت نہ ہوتی تو یقیناً" شہناز میرے لئے ایک آئیڈیل بیوی ہوتی۔ اس کے ساتھ میری زندگی بڑے عیش سے گذرتی۔

دوپہر ہونے سے پہلے ہم کوٹھی واپس آ گئے۔ فیض کے علاوہ کوٹھی میں دو ملازمین اور تھے ایک چوکیدار' دوسری ایک بوڑھی ملازمہ! بوڑھی ملازمہ کے سپرد کچن تھا اور وہ کھانا اچھا پکاتی تھی۔

اس رات شہناز نے گذشتہ رات کی طرح مجھے تڑپانا چاہا مگر میں ایسی کسی صورت حال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ میں نے اسے کمرے سے نکلنے نہ دیا آخر اسے اپنی ہار قبول کرنا ہی پڑی۔ دوسرے دن اس نے اپنے لئے الگ کمرے میں سونے کا بندوبست کر لیا۔ میں نے اس پر احتجاج کیا مگر

س پر میرے احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بہرحال ایک ضدی عورت تھی ور اپنی ضد پوری کر کے رہتی تھی وہ الگ کمرے میں سوئی۔

تیسرے دن وہ مجھے اپنی فرم کے دفتر لے گئی جو مال روڈ پر تھا۔ اس نے مجھے پروپرائٹر کے کمرے میں بٹھایا جہاں کبھی کبھار چوہدری افضل یا وہ ود آ کر بیٹھتی تھی۔ میں نے پہلے ہی دن سے کام میں دلچسپی لینا شروع کر ی۔ وہ مجھے دفتر ہی میں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے کہا تھا کہ دفتر کا وقت ختم ونے سے پہلے مجھے فون کر دینا' میں تمہیں آ کر لے جاؤں گی۔

شہناز چلی گئی تو کچھ دیر میں' فرم کے مینجر سے بات کرتا رہا پھر وہ ٹھ گیا تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ مجھے علی پور سے غائب ہوئے کئی وز ہو گئے تھے کیوں نہ میں ابو کو اپنی خیریت سے مطلع کر دوں! میں نے اس ر فوراً" عمل کیا اور ابو کو خط لکھنے لگا۔ القاب اور سلام لکھنے کے بعد میں نے ط میں لکھا ..... "جس طرح اچانک میں آپ سے ملا تھا اسی طرح تقدیر نے ھے آپ سے بچھڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں بہ خیریت اور اچھی طرح ہوں۔ یری طرف سے آپ اور امی کوئی فکر نہ کریں جمیلہ کو بھی سمجھا دیں میں شاء اللہ بہت جلد آپ سب سے آ کر ملوں گا۔ فی الحال مجبوری ہے کہ نہیں آ سکتا۔ میں اپنا موجودہ پتہ بھی اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ کیا خبر کب مجھے ہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے ایک بار پھر لکھ رہا ہوں کہ میری طرف سے طعی مطمئن رہیں۔ آپ کا بیٹا ..... فیروز۔"

خط لکھنے کے بعد میں نے اسے ایک سادہ لفافے میں بند کیا اور اس پتہ لکھ دیا پھر میں نے چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی چپراسی آ گیا تو میں

نے اسے لفافہ تھما دیا اور کہا کہ اسے ابھی ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر آؤ! میں نے اسے ٹکٹ کے لئے پیسے بھی دے دیئے۔ یہ وہی پیسے تھے جو میں علی پور سے لے کر چلا تھا نہ تو اب تک شہناز نے مجھے جیب خرچ کے لیے پیسے نہیں دیئے تھے اور نہ ہی میں نے مانگے تھے۔ ضرورت بھی نہیں پڑی تھی اب تک جو اس طرف شہناز کا یا میرا دھیان جاتا۔ ابو کو خط لکھنے کے بعد بڑی حد تک مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ کم از کم انہیں میری خیریت تو مل ہی جائے گی۔

دفتر کا وقت ختم ہونے سے کچھ پہلے انٹر کام پر مینجر نے بتایا کہ میں نے بی بی جی کو اطلاع کر دی ہے فون پر جناب کہ وہ آپ کو آ کر لے جائیں۔

میں نے مینجر کا شکریہ ادا کیا اور شہناز کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جلدی ہی آ گئی۔ واپسی میں اس نے مجھ سے کہا۔ "فیروز! تم بھی جیپ چلانا سیکھ لو تاکہ خود دفتر آ جا سکو اگر تم راضی ہو تو میں تمہیں کل صبح سے جیپ ڈرائیو کرنا سکھا دیتی ہوں۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا' میں راضی ہو گیا۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد شہناز نے مجھے ڈرائیونگ کی تربیت دینا شروع کر دی۔ دوپہر کھانے کے بعد وہ مجھے گذشتہ روز کی طرح دفتر چھوڑ آئی۔

اس واقعہ کے تیسرے دن دوپہر سے کچھ پہلے اچانک غیر متوقع طور پر چوہدری افضل گاؤں سے آ گیا۔ اس وقت میں جیپ چلانا سیکھ کر شہناز کے ساتھ واپس کوٹھی آیا تھا شہناز نے ملازمہ سے کھانا لگانے کو کہا ہی تھا کہ چوہدری افضل کسی طوفانی جھکڑ کی طرح کوٹھی میں داخل ہوا۔ معلوم نہیں کیوں اس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے اور چہرے سے شدید غصے کا

اظہار ہو رہا تھا۔

"گل کی اے بھا افضل؟ خیریت اے ناں؟" شہناز نے اپنے بھائی کو مخاطب کیا۔ اس نے بھی یقیناً اپنے بھائی کے تیور بھانپ لئے تھے۔

جواباً چوہدری افضل نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا پھر شہناز سے کہا۔ "اسے لگام دے کے رکھ ورنہ یہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا!"

"آخر کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟" شہناز نے دریافت کیا۔

"یہ تیرا چہیتا شوہر یہاں سے فرار ہونے کے منصوبے بنا رہا ہے۔" چوہدری افضل نے بتایا پھر اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور شہناز کو تھما دیا۔ "پڑھو اسے سب کچھ سمجھ جاؤ گی!"

اس لفافے پر نظر پڑتے میرا دل دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ وہی لفافہ تھا جو میں نے علی پور کے لیے پوسٹ کرایا تھا اس پر میرے ہاتھ کا پتہ لکھا ہوا تھا شہناز لفافے سے خط نکال کر پڑھنے لگی۔

"مجھے اس سے کسی ایسی ہی حرکت کی توقع تھی۔ میں اسی لئے پہلے ہی سے چوکنا تھا ڈاکیے سے میں نے کہہ رکھا تھا کہ امجد کا کوئی خط آئے تو وہ اسے دینے کی بجائے میرے پاس پہنچا دے۔"

چوہدری افضل نے انکشاف کیا اور میں یہ جاننے کے بعد کہ میرا خط' ابو کو نہیں مل سکا' ملول ہو گیا۔

"یہ تو فیروز نے واقعی بڑی غلط حرکت کی۔" شہناز نے خط پڑھ کر لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اور میں اسے اس کی اسی حرکت کی سزا دینے آیا ہوں تاکہ اسے

آئندہ کبھی ایسی جرات نہ ہو! چوہدری افضل سخت لہجے میں بولا اور پھر اس نے اپنے قریب رکھے ہوئے ایئر بیگ کو اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ فیض کو آواز دینے لگا۔ فیض آ گیا تو اس نے چوکیدار کو بلوایا میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ آخر مجھے کیا سزا دینا چاہتا ہے جب کچھ دیر بعد قوی ہیکل چوکیدار بھی آ گیا تو چوہدری افضل نے اپنی گود میں رکھے ہوئے ایئر بیگ کی زپ کھول کر اس میں چمڑے کا ایک ہنٹر اور ریشمی ڈوری نکال لی پھر اس نے سامنے برآمدے کے ایک ستون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوکیدار اور فیض سے کہا۔

"اسے فیروز کو اس ستون سے باندھ دو۔"

"یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے چوہدری افضل" میں ایک دم اچھل کر کرسی سے کھڑا ہو گیا میں تمہارا کوئی کارندہ نہیں ہوں جسے تم باندھ کر کوڑے برسانا شروع کر دو گے۔"

"پکڑ لو اسے!"

چوہدری افضل نے چوکیدار اور فیض کو حکم دیا۔

وہ دونوں تیزی سے میری طرف بڑھے مگر میں پہلے سے تیار تھا۔ فیض کے پیٹ پر میری بھرپور لات پڑی اور وہ چیختا ہوا گر پڑا۔ چوکیدار گھونسا کھانے کے باوجود مجھے اپنے گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ فیض سے زیادہ جاندار ثابت ہوا تھا مگر شانے پر پڑنے والی کھڑی ہتھیلی کی بھرپور ضرب نے اسے بھی چیخنے پر مجبور کر دیا وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

"بس بہت ہو گیا فیروز!"

معا" چوہدری افضل کی آواز سن کر میں پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں والور نظر آ رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

"اگر اب تم نے اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلنے کی کوشش کی' تو گولی مار ں گا!"

میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ چوہدری افضل کی ت مان لوں پھر چوہدری افضل کے حکم پر فیض اور چوکیدار نے مجھے آمدے کے ستون سے باندھ دیا۔ چوہدری افضل نے ریوالور جیب میں رکھ ا اور چمڑے کا ہنٹر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد وہ میرے قریب آ گیا ور ایک جھٹکے سے میری قمیض پھاڑ دی میرے جسم کا اوپری حصہ بے لباس گیا تو اس نے پیچھے ہٹ کر ہنٹر والا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ یہ اذیت ناک کھیل ینا اس سفاک شخص کے لیے نیا نہیں ہو گا ہنٹر میرے جسم کے کھلے ہوئے ے پر پڑا اور شدید تکلیف کے سبب میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ چوہدری فضل نے قہقہہ لگایا اور پھر جیسے اس پر دیوانگی طاری ہو گئی وہ پے در پے ہنٹر رسانے لگا اور میرے جسم کی کھال ادھڑنے لگی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ری چیخیں اسے مزید تشدد کرنے پر اکسا رہی تھیں۔

"بس کرو بھا افضل!" شہناز چپ نہ رہ سکی۔" اس کے لیے اتنی زا کافی ہے' اب یہ کبھی علی پور خط نہیں لکھے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب وئی۔ "بھا افضل سے معافی مانگ لو فیروز!"

"نہیں!" میں تکلیف و اذیت کے باوجود چیخ اٹھا۔ میں نے کوئی جرم ہیں کیا۔ میں معافی نہیں مانگوں گا۔"

معافی مانگنے سے انکار مجھے مہنگا پڑا نتیجتاً میرے جسم پر زخموں کے نشانات میں مزید اضافہ ہو گیا چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا اور پھر آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا بالآخر میرے ذہن پر اندھیرے کی چادر پھیل گئی۔ معلوم نہیں اس علاقے میں رہنے والے بہرے تھے یا بے حس کہ میری چیخوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا کوئی بھی حقیقت حال دریافت کرنے نہیں آیا تھا۔ شاید بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والے لوگوں کے سینوں میں دل نہیں ہوتے۔

معلوم نہیں کب تک میں بے ہوش رہا۔ ہوش آنے پر میں نے خو
کو اپنے کمرے میں بستر پر دیکھا۔ شہناز میرے سرہانے بیٹھی تھی اور اس کے
چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا میرے سینے' دونوں بازوؤں' گرد
اور پیٹ پر دوا لگی ہوئی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا جسم سنگ ر
ہو۔ شدید تکلیف کے سبب میں ہوش میں آتے ہی کراہنے لگا۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر شہناز مجھ پر جھک گئی اور بھرائی ہوئی آ
آواز میں بولی بھا افضل نے تمہارا کیا حال کر دیا فیروز! مگر غلطی تمہاری بھ
ہے تمہیں اس سے معافی مانگ لینی چاہئے تھی پھر وہ مجھے چمچے سے چکن سو
پلانے لگی اور مزید بولی۔

"بھا افضل چلا گیا ہے اور جاتے جاتے کہہ گیا ہے کہ اب اگر تم
تم نے اپنے گھر والوں کو خط لکھا یا کسی طرح ان سے رابطہ قائم کرنا چاہا تو
تمہارا حشر اس سے برا کرے گا۔"

پھر میں چار دن سے پہلے بستر سے نہ اٹھ سکا۔ اس دوران ش

ز ایک وفا شعار بیوی کی طرح میری تیمار داری کرتی رہی۔ اس کے بعد
شب و روز شروع ہو گئے میں دوپہر کے بعد دفتر جانے لگا صبح کے وقت
شہناز سے جیپ چلانا سیکھتا تھا۔ ایک مہینے کے اندر اندر مجھے جیپ چلانا آ
اور شہناز نے میرا ڈرائیونگ لائسنس بنوادیا۔

شادی کے تیسرے ماہ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ شہناز ماں بننے والی
۔ لیڈی ڈاکٹر نے دو ماہ بعد کی ڈیٹ دی تھی۔ شہناز مجھے ہی ساتھ لے کر
ٹر کے ہاں گئی تھی۔

"فیروز! تم افسردہ اور خاموش خاموش سے کیوں ہو؟ واپسی میں
ناز نے مجھے مخاطب کیا تمہیں خوشی نہیں کہ تم باپ بننے والے ہو؟"

"شہناز میں اتنا بچہ بھی نہیں ہوں کہ یہ نہ سمجھ سکوں' ہونے والے
بچے کا باپ میں نہیں ہوں"! میں تلخ لہجے میں بولا تم کسی اور کا گناہ میرے
رڈال رہی ہو۔ یہ گناہ کا بوجھ جو تم اٹھائے پھر رہی ہو میرا نہیں ہے تم مجھے
ھوکا نہیں دے سکتیں اب میں سمجھ چکا ہوں کہ تم نے زبردستی مجھ سے
ح کیوں پڑھوایا تھا!"

اپنے گناہ پر شرمندہ یا متاسف ہونے کی بجائے شہناز ہنس دی۔ پھر
لنے لگی۔

میرے شوہر تو تمہی ہو اور میرے بچے کے باپ بھی تمہی کہلاؤ
گے۔

"میں تم پر اور تمہارے ہونے والے بچے پر لعنت بھیجتا ہوں" میں
نے سخت لہجے میں کہا.....

اب میں خود جیپ ڈرائیو کرتا تھا اور جیپ ہی میں دفتر آتا جاتا تھا ابو کو اب علی پور خط لکھنا تو لاحاصل ہی تھا کہ وہ خط انہیں نہیں ملتا رفتہ رفتہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ خود ہی کبھی علی پور جاؤں دن بھر میں گھر سے باہر رہتا تھا علی پور آنے جانے میں چھ گھنٹے سے زیادہ صرف نہ ہوتے۔ دفتر کے اوقات میں اگر میں علی پور کا ایک پھیرا لگا آتا تو شہناز کو خبر بھی نہ ہوتی دفتر جانے کے لئے میں صبح ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور وہاں سے گھر پہنچتے پہنچتے مجھے شام کے ساڑھے پانچ بج جاتے تھے یوں تقریباً" نو گھنٹے میں گھر سے باہر گزارتا تھا۔ میں سنجیدگی سے یہ سوچنے لگا کہ اگر کسی دن دو ایک گھنٹے دفتر میں گزار کر علی پور چلا جاؤں تو دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے دوبارہ دفتر پہنچ سکتا ہوں۔ یوں بھی اب چوہدری افضل کو دھمکی دیئے خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں نہ میں نے ابو کو کوئی خط لکھا تھا نہ علی پور گیا تھا یقیناً اب وہ میری طرف سے مطمئن ہو گا۔

میں اپنے دیرینہ دشمن ملک سرفراز کو بھی نہیں بھولا تھا میں اس سے بھی انتقام لینے کے منصوبے بناتا رہتا تھا چھ سات گھنٹے کے لئے دفتر سے غائب ہو کر کسی دن میں اس کا قصہ بھی پاک کر سکتا تھا۔ یوں میں قانون کی گرفت سے بھی محفوظ رہ سکتا تھا مگر مزید سوچ بچار کے بعد اس خیال کو میں نے رد کر دیا۔ دن کی روشنی میں مجھے دیکھا جا سکتا تھا ملک سرفراز کو قتل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ میں سورج غروب ہونے کے بعد علی پور پہنچتا اور پھر رات کے اندھیرے میں واپس لاہور آجاتا۔ رات کے وقت علی پور سے کوئی بس لاہور کے لیے نہیں ملتی تھی۔ وہاں سے رات کے وقت

واپسی کے لئے یہ ضروری تھا کہ میرے پاس اپنی سواری ہوتی۔ میں سوچتا رہا اور دن گزرتے رہے اس وقت تک میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا جب تک ہر پہلو پر اچھی طرح غور نہ کر لیتا۔

میرے نزدیک ابو' امی اور جمیلہ سے ملاقات ثانوی حیثیت کی حامل تھی۔ پہلے اپنے سینے میں بچپن سے بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو میں سرد کرنا چاہتا تھا اس کی واحد صورت یہی تھی کہ میں اپنے دشمن ملک سرفراز کو جہنم رسید کر دیتا۔

چوہدری افضل کے لیے بھی میرے دل میں شدید نفرت تھی میں اسے بھی معاف کرنے کے حق میں نہیں تھا مگر یہ بعد کی بات تھی اس سے اور شہناز سے میں بعد میں بھی نمٹ سکتا تھا۔

اچانک ایک روز میرے ذہن میں مسئلے کا حل آ ہی گیا۔ میں اس روز شہناز کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اس کا معائنہ کرانے! شہناز کے ماں بننے میں اب صرف تین ہفتے رہ گئے تھے میں نے سوچا کہ شہناز کو بہر حال ہسپتال داخل ہونا پڑے گا اور وہ کوٹھی میں نہیں ہوگی۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اس طرح شہناز کو بھی کچھ معلوم نہ ہوتا اور میں قانون کی گرفت سے بھی محفوظ رہتا۔ جیپ تو تھی ہی میرے پاس! میں شام کو پانچ بجے دفتر سے نکلتا اور گھر واپس جانے کی بجائے علی پور پہنچ جاتا پھر نصف شب سے پہلے ہی واپس لاہور آ جاتا کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ آتا کہ ملک سرفراز کو میں نے قتل کیا ہو گا۔ میں نے جہاں اتنے طویل عرصے صبر کیا تھا مزید چند ہفتے اور صبر کر سکتا تھا لمبے پھل کا وہ چاقو اب تک میرے پاس تھا

جو میں نے اکبر کو قتل کرنے کے لیے خریدا تھا میرے والد کے سینے میں چاقو اتارا گیا تھا اس لئے میں بھی اس کے اصل قاتل کو اسی طرح قتل کرنا چاہتا تھا۔

وہ تین ہفتے مجھے تین صدیاں معلوم ہوئے۔ ایک ایک دن بڑی مشکل سے گزرا۔ میرا اضطراب بڑھتا گیا اور مجھ پر ہیجانی کیفیت سی طاری ہو گئی۔ وہ رات کا وقت تھا جب میں اسے لے کر ہسپتال پہنچا۔ رات بھر مجھے ہسپتال میں رہنا پڑا صبح کے قریب شہناز ماں بن گئی اس نے ایک بچی کو جنم دیا تھا میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لئے دفتر نہ گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آئندہ شب میں علی پور روانہ ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ صبح نو بجے کے قریب میں کوٹھی آنے کے بعد سو گیا۔ شہناز کے ایما پر فیض کو میں نے ہسپتال بھیج دیا تھا شام چار بجے میں سو کر اٹھا تو جیسے میرے سارے منصوبے پر پانی پھر گیا چوہدری افضل لاہور پہنچ چکا تھا۔ اسے فیض نے فون پر شہناز کے ماں بننے کی اطلاع دے دی تھی چوہدری افضل کی لاہور میں موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ میں اب اپنے منصوبے پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دوسرے دن صبح واپس علی پور چلا گیا تو میرے دل کو سکون ہوا میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج رات ضرور علی پور جاؤں گا۔ شہناز ہسپتال میں تھی اور کوٹھی میں ملازمین کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس روز میں دفتر گیا مگر شام چار بجے سے پہلے اٹھ گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پہلے ہسپتال میں شہناز سے ملنا چاہتا تھا۔ میں اسے یہ اطمینان دلا کر اب کوٹھی جا رہی ہوں علی پور روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ میں ہسپتال پہنچا تو فیض بھی تھا جب میں اٹھنے لگا تو شہناز نے مجھ سے کہا فیض

کو بھی اپنے ساتھ کوٹھی لے جاؤ! مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ فیض ہسپتال میں ہو گا اور نہ میں ہسپتال سے کوٹھی جانا چاہتا تھا مگر فیض کی وجہ سے مجبوراً مجھے کوٹھی جانا پڑا۔

فیض کو اپنے ساتھ لے کر میں کوٹھی پہنچا پھر وہاں چند منٹ رک کر فیض سے کچھ کہے بغیر کوٹھی سے جیپ لے کر نکل گیا کوٹھی آنے کی وجہ سے صرف آدھے گھنٹے کا فرق پڑا تھا میں پانچ ساڑھے پانچ بجے لاہور سے علی پور کے لیے روانہ ہو سکا۔

راستے پھر میری آنکھوں میں اپنے مقتول والد' بھائی اور ماں کے چہرے گھومتے رہے اور انتقام کی آگ تیز سے تیز تر ہوتی گئی جذبات میں ہیجان کے سبب جیپ کی رفتار بھی تیز ہو گئی مگر میں نے اسے بے قابو نہ ہونے دیا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے تین گھنٹے کی بجائے میں ڈھائی گھنٹے ہی میں علی پور کے قریب پہنچ گیا میرا دل اس وقت بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

علی پور کی آبادی شروع ہونے ہی والی تھی کہ بیچ سڑک پر مجھے ایک شخص ہاتھ اٹھائے کھڑا ہوا نظر آیا اس کے ہاتھ میں بندوق تھی مزید دو بندوق بردار سڑک کے کنارے کھڑے تھے مجبوراً مجھے جیپ روکنا پڑی۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں ان میں سے ایک نے جیپ رکتے ہی قریب آ کر ٹارچ کا رخ میری طرف کر دیا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر پڑا اور پھر وہ شخص اپنے بندوق بردار ساتھیوں سے بلند آواز میں مخاطب ہوا

"وہی ہے"

مجھے اس شخص کی آواز جانی پہچانی سی لگی۔

"کون ہو تم؟ اور تم نے مجھے کیوں روکا ہے؟"

میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"مینوں نئیں پچھانڑ دے باؤ جی! میرا ناں بخشواے۔"

جیپ کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے کہا..... اسی نے میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اس کی آواز مجھے جانی پہچانی کیوں لگی تھی! وہ چوہدری افضل کا ملازم تھا اور ظاہر تھا کہ اس کے ساتھ بھی چوہدری افضل ہی کے آدمی ہو سکتے تھے۔ انہیں اپنے راستے کی دیوار بنے ہوئے دیکھ کر میں حیرت زدہ ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پہلے ہی سے وہاں میری آمد کے منتظر تھے جیپ کے قریب اب بخشو کے دونوں بندوق بردار ساتھی بھی آ گئے تھے ان کی بندوقوں کا رخ میری طرف تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے اپنی آواز کو رعب دار بناتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں چوہدری افضل کا بہنوئی ہوں!"

"باؤ جی! ہم چوہدری کے حکم پر تو یہاں آئے ہیں۔" بخشو کا ایک ساتھی بولا یہ حکیمے تھا۔

"چوہدری افضل کا حکم ہے کہ آپ کو گاؤں میں داخل نہ ہونے دیا جائے!"

"بہتر یہی ہے باؤ جی کہ آپ لاہور لوٹ جائیں ورنہ آپ چوہدری کو تو جانتے ہی ہیں! چوہدری کا غصہ خراب ہے۔" بخشو نے مجھے سمجھایا۔

"اور اگر میں تم لوگوں کی بات نہ مانوں تو؟" میں بولا۔

"تو پھر مجبوراً جی ہمیں فیر کر کے جیپ کا ٹائر فاڑنا ہو گا اور پھر پ کو چوہدری کے پاس لے جانا ہو گا۔" حکیمے نے جواباً کہا۔

میں نے چند لمحے کچھ سوچا' پھر نرم لہجے میں بولا "اچھا ٹھیک ہے میں اپس جا رہا ہوں مگر ایک وعدہ کرو کہ چوہدری افضل کو نہیں بتاؤ گے' میں اں آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے باؤ جی' ہم چوہدری سے کہہ دیں گے کہ آپ نہیں ئے۔" بخشو نے وعدہ کر لیا۔

میں نے جیپ موڑی اور پھر واپس چل دیا چند میل جا کر میں نے یپ روک دی اور کچھ دیر کے بعد دوبارہ علی پور کی طرف چل دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اب وہ لوگ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے ہوں مگر میرا اندازہ لط ثابت ہوا وہ ابھی تک اپنی جگہ موجود تھے۔ انہوں نے دوبارہ میری جیپ روک لی میں اس لئے جیپ روکنے پر مجبور تھا کہ وہ مسلح تھے اور جیپ نہ روکنے کی صورت میں فائر بھی کر سکتے تھے۔

"چوہدری نے ٹھیک ہی کہا تھا بخشو! باؤ جی پھر آ گئے۔"

حکیمے نے میرے چہرے پر ٹارچ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اگر دہری نے ہمیں دوبارہ یہاں نہ بھیجا ہوتا تو......"

بات بگڑتی دیکھ کر میں جلدی سے بول اٹھا۔ "حکیمے! مجھے بس چند نٹ کو اپنے ابو اور امی سے مل لینے دے پھر میں واپس چلا جاؤں گا۔"

یرے لہجے میں التجا تھی۔

"ناں جی ناں! اگر چوہدری کو خبر ہو گئی تو وہ کھال گرا دے گا میر
زمین پر" اس نے صاف انکار کر دیا۔

میں نے سوچا تھا کہ آج رات ملک سرفراز کو قتل نہیں کر سکا تو
سے کم ابو' امی اور جمیلہ سے تو مل ہی لوں مگر حکیمے نے میری ار
آرزو کو بھی خاک میں ملا دیا اگر وہ لوگ مسلح نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ میں ا
سے بھڑ جاتا بالآخر مجھے علی پور سے ناکام و نامراد واپس آنا پڑا۔ میں نصف
شب گزرنے کے بعد ساڑھے بارہ بجے لاہور پہنچا تھا خلاف توقع فیض جاگ
رہا تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کہاں گئے تھے باؤ جی؟"

"جہنم میں۔"

یہ کہتا ہوا میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس رات دیر تک مجھے نیند نہ آ سکی یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ
وغیرہ نے چوہدری افضل کو میرے متعلق نہ بتایا ہو۔ چوہدری افضل ج
صرف ایک خط لکھنے پر میری کھال ادھیڑ سکتا تھا تو یہ "جرم" بہر حال انہ
سنگین تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک دو دن میں وہ ضرور لاہور آئے گا اور
نہ جانے اس بار میرا کیا حشر کرے میں اس روز کے بعد سے اسی لئے سہا
سا رہنے لگا کہ کیا خبر چوہدری افضل کب بلائے ناگہانی کی طرح لاہور آ جا
مگر تین دن گزر جانے کے بعد بھی وہ نہیں آیا اور شہناز اسپتال سے گ
گئی۔ دوسرے دن جب میں دفتر سے کوٹھی پہنچا تو شہناز نے مجھے سمجھایا۔
فیروز! تم کیوں اپنی جان کے دشمن ہو گئے ہو! تمہیں آخر علی پور جانے کی

ضرورت تھی۔

جواباً میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے یہ بات کیسے معلوم
ہو گئی! پھر یہی سوال میری زبان پر بھی آ گیا۔

"اس بات کو چھوڑو فیروز کہ مجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی میں نے
آج بڑی منت سماجت کر کے بھا افضل کو واپس گاؤں بھیجا ہے کہ اب کبھی تم
سے ایسی غلطی نہیں ہو گی۔

"تو ..... تو کیا وہ ...... وہ آج آیا تھا؟" میں نے خوف زدہ سی
آواز میں پوچھا۔

"ہاں!" شہناز نے جواب دیا" تمہارے دفتر جانے کے کچھ دیر بعد
ہی وہ آ گیا وہ تو دفتر جا رہا تھا میں نے بڑی مشکل سے اسے روک دیا تھا۔
وعدہ کرو فیروز کہ اب تم کبھی علی پور نہیں جاؤ گے۔"

میں نے مصلحتاً شہناز سے وعدہ کر لیا۔ اس نے بہر حال مجھے ایک
یقینی اذیت سے بچا لیا تھا اب میں کچھ دن خاموش رہ کر از سر نو منصوبہ بندی
کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا اب ملک سرفراز ہی کے ساتھ چوہدری
افضل کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسی غرض سے میں نے ایک ریوالور بھی
خرید لیا تھا جس کا لائسنس میرے پاس نہیں تھا۔ فرم سے اب ہر ماہ بہ طور
مینجنگ ڈائریکٹر مجھے پانچ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی یہ راہ مجھے فرم کے
مینجر نے سمجھائی تھی فرم کے اختیارات شہناز کے پاس تھے۔ اس نے میری
بات فوراً" مان لی تھی یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ شہناز
ماں بننے والی ہے۔ میں شہناز سے خفا تھا اور وہ مجھے خوش کرنا چاہتی تھی تاکہ

میں اس کے گناہ کو خاموشی کے ساتھ اپنے سر لینے پر راضی ہو جاؤں۔ ریوالور میں نے اس لیے خریدا تھا کہ کیا خبر کب مجھے کس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ چوہدری افضل جیسے عیار شخص کو ٹھکانے لگانا آسان نہیں‘ اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا۔

مجھے علی پور سے ناکام لوٹے ایک ماہ سے اوپر ہو گیا تھا اور اب میں پھر وہاں جانے کے منصوبے بنا رہا تھا ابھی میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا کہ ایک ایسی بات معلوم ہوئی جس نے مجھے سرتاپا انتقام بنا دیا۔ اب میں ہر مصلحت کو پس پشت ڈال کر پہلے چوہدری کو ٹھکانے لگانے علی پور روانہ ہو گیا۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ چوہدری افضل نے مجھے علی پور آنے سے کیوں روک دیا تھا ہوا یہ کہ میں دفتر سے کوٹھی کی طرف لوٹ رہا تھا کہ راستے میں علی پور کا ایک شخص مجھے مل گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ چوہدری افضل نے سارے گاؤں میں مشہور کر دیا تھا کہ جمیلہ سے اس کے غلط تعلقات ہیں۔ لوگوں نے اسے میرے ابو کے گھر آتے جاتے دیکھا تھا اب میرے ابو نے چوہدری افضل پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ ان کے گھر نہ آئے تھا مگر اب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ ابو نے چوہدری افضل سے کہلوایا تھا کہ اگر تم نے جمیلہ کو اغوا کرایا تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ اس سے پہلے کہ چوہدری افضل ‘ جمیلہ پر ہاتھ ڈالتا میں اسے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میرے لئے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ جمیلہ مجھ سے بے وفائی کر سکتی تھی۔

میں تیز رفتاری سے جیپ چلاتا ہوا علی پور کے نواح میں پہنچ چکا تھا کہ اچانک فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی کسی طرف سے میری جیپ پر فائر

کیا گیا تھا میں نے جیپ کی رفتار کم کر دی اور جیپ سے ریوالور نکال لیا۔ اسی وقت دوسرا فائر ہوا اور جیپ نے ہچکولا کھایا میری جیپ کے پچھلے ٹائر کو نشانہ بنا دیا گیا تھا مجبوراً مجھے جیپ روکنا پڑی۔ میں نے غصے میں اس طرف جوابی فائر کیا جدھر سے فائرنگ ہو رہی تھی اس کے فوراً بعد چوہدری افضل کی بھاری آواز گونجی۔ ”فیروز! تمہارے پاس جو بھی اسلحہ ہے پھینک دو ورنہ تمہارے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا!“ اپنی بات کے ثبوت میں چوہدری افضل کی طرف سے پے در پے کئی فائر ہوئے۔ ایک گولی تو میرے بالکل قریب سے گزری اور میں ساکت رہ گیا۔

مسلسل گولیاں چلنے سے میں سمجھ گیا کہ چوہدری افضل تنہا نہیں ہے۔ بعد میں یہ بات درست ثابت ہوئی۔ میں نے ریوالور پھینک دیا دائیں جانب موجود جھاڑیوں سے کئی سائے نکلے اور جیپ کی طرف بڑھے قریب آنے پر میں نے دیکھا کہ ان سبھی کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں یہ دوسرا موقع تھا کہ مجھے علی پور میں داخل ہونے سے پہلے روک لیا گیا تھا۔ معلوم نہیں کیسے چوہدری افضل کو خبر ہو جاتی تھی کہ میں علی پور آ رہا ہوں چوہدری افضل کے آدمیوں نے مجھے جیپ سے نیچے گھسیٹ لیا پھر وہ چوہدری افضل کے حکم پر مجھے زدو کوب کرنے لگے۔ چوہدری افضل بندوق تانے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے فٹ بال بنا لیا تھا ذرا ہی دیر کے بعد میں نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا۔ چوہدری افضل نے اپنے آدمیوں سے میری جیپ کا پہیہ بدلوایا میں اس دوران میں زمین پر پڑا رہا چوہدری افضل میرے قریب آیا اور مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا پھر جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر

بٹھا کر بولا کہ آج تو میں تجھے زندہ جانے دے رہا ہوں مگر آئندہ ادھر آیا تو تیری لاش ہی گرے گی یہاں پھر وہ اپنے آدمیوں کو سرگوشی کے انداز میں کچھ ہدایات دے کر گاؤں کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر میں میری حالت سنبھل گئی اور میں اس قابل ہو گیا کہ جیپ ڈرائیور کر سکوں۔ چوہدری افضل کے آدمی اب بھی میری راہ روکے کھڑے تھے مجبوراً" جیپ موڑنا پڑی اس دوسری ناکامی کے باوجود میرا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا۔ لاہور آ کر میں ایک بار پھر سوچنے لگا کہ اپنے دشمنوں سے کس طرح انتقام لوں۔ چوہدری افضل کو بھی اب میں نے اپنا دشمن سمجھ لیا تھا شہناز نے علی پور سے میری واپسی پر مجھے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی تھی مجھے اس قدر پیٹا گیا تھا کہ دو روز میں دفتر جانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اب تک میں دن کے وقت کبھی علی پور "نہیں گیا تھا میں نے سوچا ممکن ہے دن کے وقت مجھے کامیابی ہو جائے میں اب دوسرا ریوالور خرید چکا تھا کیونکہ پہلا ریوالور علی پور ہی میں رہ گیا تھا اب میرا پہلا نشانہ چوہدری افضل تھا میں اگلے ہفتے ہی ایک روز دفتر میں کچھ دیر بیٹھ کر مینجر سے کہے بغیر جیپ لے کر علی پور کی طرف چل دیا۔ اب مجھے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ میں دیکھ لیا جاؤں گا میں ہر قیمت پر چوہدری افضل اور ملک سرفراز کو قتل کرنا چاہتا تھا چاہے اس کی خاطر مجھے پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے ابھی جیپ لاہور شہر کی حدود سے نکلی ہی تھی کہ میں نے جیپ کی بجائے بس میں علی پور جانے کا فیصلہ کیا۔ میں جیپ میں واپس مال روڈ اپنے دفتر پہنچا اور وہاں جیپ چھوڑ کر بس اسٹینڈ کا رخ کیا اپنے پروگرام میں یہ تبدیلی میں نے اس لئے کی تھی

کہ چوہدری افضل یا اس کے آدمی' جیپ ہی سے میری آمد کے منتظر ہوتے۔

دوپہر سے کچھ پہلے میں بس کے ذریعے علی پور پہنچ گیا۔ اب میں انتہائی چوکنا تھا میرا ایک ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں تھا اور اسی جیب میں ریوالور تھا بس سے اترتے ہی اچانک نہ جانے کدھر سے نکل کر چوہدری افضل کے آدمیوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا۔ وہ چادریں اوڑھے ہوئے تھے جن کے نیچے بندوقیں چھپی ہوئی تھی ان میں سے دو نے میری دائیں اور بائیں آ کر بندوقوں کی نالیں میرے جسم سے لگا دی تھیں پھر مجھے خاموشی سے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا کچھ دور جاتے ہی ان میں سے ایک نے مجھے اس طرح چادر اڑھا دی تھی کہ میرا چہرہ چادر میں چھپ گیا تھا۔

وہ لوگ کشاں کشاں مجھے چودھری افضل کے گھر لے آئے مجھے دیکھ کر چوہدری کی آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے۔ اس نے مجھے چمڑے کے ہنٹر سے اس قدر مارا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آنے پر پھر مجھے زدو کوب کیا گیا اور شدید اذیت کے سبب مجھ پر پھر غفلت طاری ہو گئی۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو اسی نیم تاریک کوٹھری میں پایا جہاں پہلے بھی دو دن اور ایک رات گزار چکا تھا۔ رات کو کوٹھری کا دروازہ کھلا تو شہناز پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ میری حالت بہت ابتر تھی اس رات شہناز مجھے جیپ میں ڈال کر لاہور لے آئی میرے زخم کئی دن میں مندمل ہوئے اس دوران میں شہناز میری تیمارداری بھی کرتی رہی اور مجھے سمجھاتی بھی رہی کہ میں علی پور کا رخ کر کے اب اپنی موت کو دعوت نہ دوں اس نے کہا تھا کہ اب اگر تم بھولے

سے بھی علی پور چلے گئے تو افضل تمہیں قتل کر دے گا۔

اب تک یہ بات میرے لئے معمہ بنی ہوئی تھی کہ چودھری افضل کو پہلے سے کس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ میں علی پور آ رہا ہوں؟ میں نے شہناز سے یہ سوال کرنے کے بعد وعدہ کیا کہ اگر مجھے اپنے سوال کا جواب مل جائے گا تو پھر میں کبھی علی پور نہیں جاؤں گا بڑی مشکل سے اور بار بار یقین دہانی کے بعد شہناز نے مجھے بتایا کہ جب تم دفتر سے چلتے ہو تو مینجر فون کر کے مجھے مطلع کر دیتا ہے اور جب تم گھر نہیں پہنچتے تو فون کر کے افضل کو آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ چوکنا ہو جائے پہلی بار کے بارے میں شہناز نے کہا پہلی مرتبہ فیض نے تمہیں کوٹھی میں نہ پا کر پہلے ہسپتال جا کر دیکھا' پھر میرے ایماء پر علی پور فون کر دیا۔

یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اپنی قسمت پر شاکر ہو کے بیٹھ جاتا اس لئے صحت یاب ہوتے ہی کوئی اور نئی راہ سوچنے لگا اور چند ہی روز میں مجھے ایک راہ سوجھ ہی گئی لاہور میں رہتے ہوئے تو اس کا امکان نہیں تھا کہ میں علی پور کا رخ کرتا اور چودھری افضل کو خبر نہ ہوتی ایسی صورت میں صرف ایک یہی راہ تھی کہ میں لاہور سے فرار ہو جاؤں اور کچھ دن کسی شہر میں روپوش رہ کر اچانک کسی دن موت کا فرشتہ بن کر علی پور پہنچ جاؤں میرے پاس خاصی رقم تھی چند روز تو کیا مہینوں میں کسی شہر میں روپوش ر سکتا تھا اس منصوبے پر عمل کرنے ہی والا تھا کہ ایسا اندوہناک واقعہ پیش آ جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

ہوا یہ کہ ایک شام جب میں کوٹھی پہنچا تو عمارت کی حدود میں

اخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گیا میں نے شہناز کی تیز آواز سنی تھی وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔

"اگر اب تم نے ایک قدم بھی اٹھایا تو میں گولی مار دوں گی!"

"شہناز! اب میں مزید صبر نہیں کر سکتا! اگر تو میرے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں تو میں اپنی بچی کو یہاں سے لے جاؤں گا! تو مجھے نہیں روک سکتی! یہ میرا خون ہے۔"

یہ آواز شہناز کے ملازم فیض کی تھی جسے سن کر میں جیسے پتھر کا ہو گیا میرے لئے یہ انکشاف ناقابل یقین حد تک حیران کن تھا کہ اس بچی کا اپ فیض تھا جس نے شہناز کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔

"تو پاگل ہو گیا ہے فیض! یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ میں تیرے ساتھ فرار ہو کر کسی اور شہر میں از سر نو زندگی شروع کروں میری بچی مجھے ے دے ورنہ میں تیرا خون کر دوں گی!" شہناز کی آواز پھر ابھری۔

"تو پھر کر دے خون! چلا دے گولی! لے دیکھ لے میں جا رہا....."

فیض کے الفاظ بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ایک دھماکا ہوا اسی کے ساتھ شہناز کی چیخ سنائی دی۔

"میری بچی! ...... ظالم! تو نے میرے ہی ہاتھوں میری بچی کو قتل کرا دیا۔ میں تجھے بھون ڈالوں گی!"

پھر یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔

"خون! ...... خون! ...... خون! میں نے ملازمہ کی چیخیں سنیں۔

"یہ ..... یہ میں نے کیا کیا ..... کیا کر دیا! ..... کیا کر دیا؟" شہناز

چیخنے لگی اسی کے ساتھ ایک اور دھماکے نے میرے ہوش اڑا دیئے۔

کہیں شہناز نے تو خود کو گولی نہیں مار لی؟" میں نے سوچا اور بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوا اندر ایک ہولناک منظر میرا منتظر تھا میرا قیاس درست ثابت ہوا تھا شہناز نے اپنی بچی اور فیض کو گولی مارنے کے بعد خود کشی کر لی تھی وہاں تین لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں اور ملازمہ دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ گولیاں چلنے کی آواز سن کر چوکیدار اندر دوڑا چلا آیا اور پھر اس نے پولیس کو فون کر دیا پولیس کی آمد تک میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا ملازمہ اب تک بے ہوش تھی چوکیدار نے بیان دیا تھا کہ جب وہ اندر پہنچا تو اس نے تین لاشیں دیکھیں اور اسے میں وہاں نظر آیا فوری طور پر پولیس نے مجھے حراست میں لے لیا میں حوالات میں بند تھا کہ رات نو بجے کے قریب چودھری افضل تھانے پہنچ گیا اسے چوکیدار نے فون پر اندوہناک واقعہ کی خبر دی تھی اب تک پولیس نے میرا بیان لینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

پیسے میں کتنی طاقت ہوتی ہے مجھے پہلی بار اس کا اندازہ ہوا کیس کا رخ بدل دیا گیا جس میں ملازمہ کا بیان کلیدی حیثیت کا حامل تھا۔ کیس یہ بنایا گیا کہ شہناز کا ملازم فیض اس کی بچی کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا کہ شہناز نے اسے روکا جب وہ نہ رکا تو مجبوراً" شہناز کو گولی چلانا پڑی پہلی گولی بچی کو لگی بچی کی ہلاکت کے بعد شہناز نے دو گولیاں فیض پر چلائیں جو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا پھر شہناز نے اپنی کنپٹی پر گولی مار کر خود کشی کر لی۔ چودھری افضل نے مجھے بھی یہی بیان دینے کی تاکید کی تھی شہناز اب مر چکی تھی اور

مرنے والوں کا پردہ فاش نہیں کرتے' یہ سوچ کر میں بھی اصل بات چھ
کہ فیض کیوں بچی کو اغواء کر کے لے جا رہا تھا؟

دوسرے دن شہناز اس کی بچی اور فیض کی تدفین کر دی گئی
چودہری افضل مجھے لاہور ہی چھوڑ کر گاؤں واپس چلا گیا شہناز کی اچانک
موت نے مجھے اتنا حواس باختہ کر دیا تھا کہ چودہری افضل سے انتقام لینے
خیال میرے ذہن کے نہ جانے کس گوشے میں جا سویا تھا! مجھے یہ خیال ا
وقت آیا تھا جب چودھری افضل گاؤں واپس جا چکا تھا لیکن اب کچھ نہیں
سکتا تھا۔ میں چاہتا تو علی پور واپس جانے سے قبل چودھری افضل کو ٹھکانے
سکتا تھا۔ میں اس وقت یہ سوچتے ہوئے اس بات سے لاعلم تھا کہ وا
چودہری افضل کی زندگی کا وہ آخری دن تھا۔ چودہری افضل دوپہر ایک
گیا تھا اور شام کو ساڑھے چار بجے مجھے فون پر بخشو نے چودھری افضل
قتل کی اطلاع دی۔ اس نے صرف یہ بتایا کہ میرے ابو نے چودھری اف
کو گولی مار دی ہے اس نے مجھ سے جلد از جلد علی پور پہنچنے کو کہا تھا شہنا
شوہر ہونے کے ناطے اب میں ہی اس خاندان کا واحد والی وارث بچا
رات سوا سات بجے تک میں علی پور پہنچ گیا وہاں کئی روح فرسا خبریں م
منتظر تھیں جنہیں سن کر میرا دل لہو لہو ہو گیا میں اپنے حواسوں میں نہ رہا
شدت غم میں دیواروں سے سر ٹکرانے لگا کئی دن میری یہی حالت رہی
جب مجھے کچھ ہوش آیا تو چودہری افضل' ابو اور امی سبھی اپنی قبروں میں
سوئے تھے اور جمیلہ ...... وہ تو ابو' امی سے ایک روز پہلے ہی زمین کا ر
بن چکی تھی۔

ان واقعات کو برسوں گزر چکے ہیں مگر میرے زخم اب بھی ہرے ہیں۔ یہ زخم مرے جسم پر نہیں لگے کہ مندمل ہو جائیں' یہ زخم میری روح پر لگے ہیں جو شاید ہمیشہ تازہ رہیں گے۔ چوہدری افضل نے جمیلہ کے ساتھ اپنے ناجائز تعلقات کا چرچا کیا اور پھر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے جمیلہ کو اغوا کر لیا اور ایک رات اپنے گھر میں رکھ کر آزاد کر دیا۔ جمیلہ یہ ذلت و رسوائی برداشت نہ کر سکی -------- اس نے خود کشی کر لی۔ اپنے گھر پہنچتے ہی جمیلہ نے کیڑے مار زہریلی دوا پی لی تھی ممکن ہے کہ ابو اسی رات چوہدری افضل کو گولی مار دیتے' لیکن جب وہ جمیلہ کو دن مندے سپرد خاک کر کے لوٹے تو چوہدری افضل لاہور روانہ ہو چکا تھا۔ اسے فون پر چوکیدار نے اس اندوہناک واقعہ کی اطلاع دیدی تھی جو لاہور میں پیش آیا تھا۔ وہ رات چوہدری افضل نے لاہور میں گزاری پھر دوسرے دن جب وہ علی پور پہنچا تو میرے ابو کی گولی کا نشانہ بن گیا ابو نے اس سے جمیلہ کا انتقام لے لیا تھا پھر انہوں نے خود کو بھی گولی مار لی تھی جوان بیٹی اور دوسرے ہی دن شوہر کی موت کے صدمے نے امی کی جان لے لی۔ یوں ایک ہنستا بستا گھر اجڑ گیا۔ میں خود کو ایک بار پھر بھری دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگا۔

روتے روتے جی کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میرا ایک پرانا زخم لو دینے لگا مجھے پہلی بار اس دنیا میں تنہا کرنے والا' میرا گھر اجاڑنے والا میرے خیال میں ابھی زندہ تھا۔ ہاں میں ملک سرفراز ہی کا ذکر کر رہا ہوں چوہدری افضل کی موت کے بعد اب میں اتنا با اثر ہو چکا تھا کہ ملک سرفراز کو اپنے کسی کارندے سے قتل کرا دیتا مگر وہ میرا مجرم تھا۔ اسے میں اپنے ہاتھ سے قتل

کرنا چاہتا تھا' اس کے سینے میں خود چاقو اتارنے کا آرزو مند تھا۔ مجھے علی پور آئے یہ چوتھا دن تھا میں دن ڈھلے اپنی جیب میں چاقو رکھ کر اور کسی کو کچھ بتائے بغیر بڑی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں وہاں پہنچا تو حویلی پر ایسا سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ حویلی کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی ایک طرف سے مجھے مردہ سی مگر کچھ جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

پھر قدموں کی چاپ ابھری چند ہی لمحوں کے بعد میرے سامنے شیدے کھڑا تھا۔

"آپ ماسٹر جی!"

"ہاں میں!"

میں تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بولا۔" "مجھے ملک جی سے ملنا ہے' انہیں خبر کر دو!"

شیدے اس طرح میری شکل دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو' پھر وہ خود ہی بول اٹھا۔ "شاید آپ کو معلوم نہیں ماسٹر جی کہ ملک جی کو گزرے تو ایک مہینے سے اوپر ہو گیا۔ ان کا تو جی چالیسواں بھی ہو چکا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم شیدے!" میں زور سے بولا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین سا نہیں آیا کیا میں نے جو کچھ سنا ہے' درست ہے۔

شیدے نے دوبارہ اپنی بات دہرا دی' پھر بولا۔ "ٹھہریں جی' میں چھوٹی بی بی کو خبر کرتا ہوں۔ میں جھوٹا سہی پر وہ تو جھوٹ نہیں بولیں گی۔"

ہ کر شیدے اندر چلا گیا۔

مجھے پہلی بار ناہید کا خیال آیا وہ دولت مند ہونے کے باوجود ایک مظلوم اور تنہا لڑکی تھی۔ ناہید نے مجھے فوراً ہی اندر بلوا لیا۔

"آپ ..... آپ مجھے چھوڑ کر ..... اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے
' ناہید نے بھرائی آواز میں کہا۔

"اب ..... اب تمہیں تنہا چھوڑ کر کبھی اور کہیں نہیں جاؤں گا
!" یہ کہتے ہوئے من نے وفور جذبات میں پہلی بار اس کا ہاتھ تھام لیا'
ں کے بعد اپنے سینے کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا۔ میں نے اول تا آخر اسے
بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ناہید کو اب یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ملک
از اس کی ماں پر کیوں تشدد کرتا تھا!

دکھ بھری یادوں کا غبار چھٹا تو ناہید نے مجھے بتایا کہ ملک سرفراز
ـ سسک کر مرا تھا اس پر فالج گرا تھا اور وہ چلنے پھرنے سے محتاج ہو گیا
یہاں تک کہ خود اٹھ کر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا وہ اپنی موت کی دعائیں
تھا مگر موت اسے قبول نہیں کرتی تھی۔ پندرہ دن سے زیادہ تو اس پر
کنی کا عالم طاری رہا تھا' پھر کہیں جا کے اس نے دم دیا تھا۔

قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ میرے دامن پر لہو کا کوئی داغ نہ
شاید اسی وجہ سے نہ اکبر میرے ہاتھوں مارا گیا' نہ چوہدری افضل اور نہ
یں ملک سرفراز کو قتل کر سکا۔ قدرت نے خود میرے دشمنوں کو راستے
ہٹا دیا تھا' ان سے میرا انتقام لے لیا تھا۔

ناہید کے بارے میں میرا قیاس غلط نہیں تھا اسے واقعی مجھ سے

محبت ہو گئی تھی' لیکن اگر وہ جمیلہ کی زندگی میں اس کا اظہار کر دیتی تو شاید میں اس کی محبت کا جواب محبت سے نہ دے پاتا۔ ناہید نے مجھ سے اظہار محبت کے لیے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا جب میں بالکل اکیلا تھا اور خود وہ بھی تنہا تھی نتیجتاً میں نے اس کی محبت قبول کر لی اور اسے اپنا لیا۔

اس روز علی پور میں عید کا سماں تھا جب ناہید سے میری شادی ہوئی۔ اب میں ہی علی پور کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ ابو کی زمینوں' چودھری افضل کی تمام زمین و جائداد اور ملک سرفراز کی ساری اراضی کا اب میں ہی وارث اور مختار کل تھا۔

ہر چند کہ اب مجھے دنیا کا ہر سکھ میسر ہے مگر اب بھی جب کبھی اپنے والدین' مقتول بھائی' ابو' امی اور جمیلہ کی یاد آ جاتی ہے تو دل سے دھواں اٹھنے لگتا ہے

ختم شد